
جانب
مقبول جہانگیر


جاسوس

مقبول جہانگیر کے انتقال کو نُو برس بیہ
میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مجھے اور می
روزانہ متعدد خطوط موصول ہوتے ہیں، جن می
اور ان کی نئی کتابوں (مجموعوں) کے انتظار کا
خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں نئے پڑھے
ہیں کہ مقبول جہانگیر کے انتقال کو ایک عرص
وقتاً'' فوقتاً'' مارکیٹ میں آتی رہتی ہیں۔ کیسے
جاننا چاہتے ہیں کہ مَیں یا میرے پبلشرز مرحوم
شائد وہ اس طرز پر سوچنے میں حق بجانب ہ
نہیں ہو رہا اور صحافت و ادب میں بھی ایسے
شعبوں کی طرح جعل سازی سے مبرا نہیں ر
اصل نقل سب خلط ملط ہو چکا........ اتنا کہ
ہے کہیں نقل ہی نہ ہو۔ لیکن مشکوک ہو

چند باتیں

ت چکے ہیں لیکن اُن کے چاہنے والوں
رے پبلشر محترم سعید اے۔شیخ صاحب کو
ں مقبول کی تحریروں کی تعریف و توصیف
شدت سے اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن چند
نے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو پوچھتے
ہ گزر جانے کے بعد بھی انکی نئی کتابیں
؟......... گویا ڈھکے چھپے انداز میں وہ یہ
کا نام تو نہیں بیچ رہے؟......... اپنی جگہ
وں کہ آج کی جعل ساز سوسائٹی میں کیا
واقعات رونما ہوتے ہیں۔یہ شعبہ بھی دیگر
ہلےنام بک رہے ہیں' برانڈ بک رہے ہیں۔
اصل میسر بھی ہو تو طبیعت مشکوک رہتی
نے کا مطلب ہے کہ ابھی اصل کہیں نہ

کہیں تو باقی ہے ورنہ......... خیر باقی شعبوں کی حد تک یہ تمام باتیں درست، لیکن تحریر کا مسئلہ تو یوں ہے کہ لفظ لفظ پکار کر خود بتا دے کہ کس کے قلم سے نکلا ہے۔ مجھے اس وضاحت کی ضرورت قطعی نہ تھی لیکن گذشتہ دنوں مسقط' قطر اور سعودی عرب سے کچھ خطوط ایسے موصول ہوئے جن میں یہ سوال تھا لہٰذا ضروری سمجھا کہ یہ جواب اس تحریر میں دیا جائے تاکہ نئے پڑھنے والے بھی جان جائیں کہ "مقبول جہانگیر" وہ نام ہے جس نے قلم و قرطاس کی دنیا میں 30 برس تک تہلکہ مچائے رکھا۔ قلم چلانا اس کا شوق ہی نہیں، روزی کا وسیلہ بھی تھا۔ اس لیے اس کے جا بجا بکھرے الفاظ کے ذخیروں کو سمیٹنا اتنا سہل بھی نہیں کہ چند سالوں میں سمیٹ دیا جائے۔ اتنا محدود بھی نہیں کہ چند کتابوں میں سمو دیا جائے۔ اس قلمکار نے اتنا لکھا ہے کہ میرے پاس ابھی تک ایسے ڈھیر موجود ہیں جنہیں میں ترتیب نہیں دے پائی کیونکہ اس کارزارِ حیات میں اس کے علاوہ بھی بہت سی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو اس سے زیادہ اہم ہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے ہر مجموعے کے ساتھ حوالہ دینا ضروری سمجھوں کہ یہ مواد فلاں فلاں جگہ چھپ چکا ہے۔ کیونکہ مقبول کے مداح' ان کی تحریروں کے شیدائی ان کے لفظوں کے انتخاب' نثروں کی بناوٹ اور تحریر کی روانی و بے ساختگی سے بخوبی واقف ہیں جو کسی اور کا کمال نہیں۔ وہ شخص لفظوں کے موتی اس طرح پرونا جانتا تھا کہ کسی لڑی میں کوئی موتی چھوٹا بڑا یا فالتو نظر نہ آئے۔

بہرحال......... مقبول جہانگیر کی کچھ اور تحریروں کا تازہ مجموعہ پیشِ خدمت ہے......... نئے پڑھنے والوں کے لیے نیا تحفہ اور پرانے قارئین کے لیے "قندِ مکرر"۔

امینہ عنبریں

روزنامہ جنگ 13۔۔ سر آغا خاں روڈ لاہور

وہ اکثر یاد آتا ہے

مقبول جہانگیر میرا دوست تھا — پیارا اور مخلص دوست —
وہ ایک کھرا اور سچا انسان تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ہر مکتبِ فکر کے لوگ اس پر اعتبار کرتے اور اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا، ہر ایک کو مسرور و شادماں دیکھنے کی تمنا کرتا اور ہر ایک کے دکھ درد سمیٹ لینے کی سعی کرتا۔

وہ قلم کا مزدور تھا۔ لکھنا اس کا پیشہ تھا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ایک ایسی مثالی دنیا کی تخلیق کی خواہش رکھتا تھا جس میں کوئی دکھی، کوئی غمزدہ نہ ہو۔ اس کے قاری اس کی تحریروں کے منتظر رہتے۔ اس نے ہزاروں صفحات لکھ ڈالے۔ اس کے قلم میں بلا کی روانی اور تحریر میں بلا کی شادابی تھی جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔

وہ ایک خوش طبع اور ہنس مکھ شخص تھا۔ وہ اپنے آزردہ خاطر اور پریشان حال دوستوں کے دکھوں پر اپنے خوبصورت لفظوں کے پھاہے رکھتا تھا۔ اس کی محفل میں کوئی شخص غمگین نہیں رہ سکتا تھا۔

—— لیکن وہ اپنی ذات میں ایک ٹوٹا ہوا شخص تھا۔ وہ اپنے ناتواں جسم میں بے شمار بیماریاں لیے پھرتا تھا —— اور بالآخر ہسپتال کے بستر پر جا لیٹا —— میں جب اس کی عیادت کے لیے پہنچا تو وہ بیہوش پڑا تھا —— پھر وہ اپنی جاں نثار بیوی اور دو معصوم بچیوں اور سینکڑوں دوستوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ سدا رہے نام اللہ کا! وہ جب بھی یاد آتا ہے تو دل سے اِک ہُوک سی اٹھتی ہے —— اور وہ اکثر یاد آتا ہے!

سعید اے شیخ

فہرست

دوسری عالمگیر جنگ پانچویں سال میں
خوشگوار صبح فرانس اور سوئٹزر لینڈ کی
پینتالیس سالہ ہٹا کٹا فرانسیسی جاسوس مائیکل
زمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا
اس نے اپنے کندھے پر آلوؤں سے بھرا
تھا۔

جنگل کے تمام پرندے اپنے اپنے
کرنیں شاخوں اور پتوں میں سے چھن چھ
لمبے ڈگ بھرتا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا
احتیاط اور خاموشی سے طے کیا۔ وہ ربڑ
طرف جرمن دستے گشت کر رہے تھے۔ ا
کے پیچھے چھپ جاتا اور اس کا دل زور زو
نکل جاتے تو وہ پھر اپنی منزل کی طرف روا

جانباز جاسوس

ں داخل ہو چکی تھی۔ اکتوبر1943ء کی ایک
سرحد پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔
ہولارڈ سرحد عبور کر کے سوئٹزر لینڈ کی سر
وہ غریب لکڑہارے کے بھیس میں تھا اور
ہوا ایک تھیلا اور ہاتھ میں کلہاڑا پکڑ رکھا

گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ سورج کی
ن کر آ رہی تھیں۔ ہولارڈ سر جھکائے لمبے
تھا۔ اس نے اپنا تمام سفر بلی کی طرح نہایت
کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چاروں
ن کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ درختوں
ر سے دھڑکنے لگتا۔ جب جرمن سپاہی دور
نہ ہو جاتا۔ وہ انتہائی خطرناک مہم سر کرنے

جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر عزم و استقلال کے آثار گواہی دیتے تھے کہ اسے اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین ہے۔

ہولارڈ جنگ چھڑنے سے پہلے فرانس کے ایک صنعتی ادارے میں ڈیزائن بنانے کا کام کرتا تھا' لیکن نازیوں کے ظلم و ستم دیکھ کر اس نے اپنی زندگی ملک و قوم کے لیے وقف کر دی۔ اس نے جاسوسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس سے قبل وہ پچاس مرتبہ سوئٹزر لینڈ کی سرحد عبور کر چکا تھا۔ دشمن کی فوج کے خفیہ ٹھکانوں اور دستوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اہم معلومات جمع کرتا۔ یہ معلومات سوئٹزر لینڈ سے انگلستان پہنچا دی جاتی تھیں۔ وہ اور اس کے ساتھی فرانس میں نازیوں کے قائم کردہ تمام ہوائی اڈوں کو نیست و نابود کر چکے تھے۔ اس نے جرمنوں کے ساحلی توپ خانے اور آب دوزوں کے اڈے کا سراغ لگا لیا تھا اور برطانوی حکومت کو جرمن آب دوزوں کی نقل و حرکت اور ان کے خفیہ اڈوں سے آگاہ کر چکا تھا۔ اگرچہ اس نے اس سے پہلے دشمن کے بہت سے رازوں کو بے نقاب کر دیا تھا' تاہم اس کی موجودہ مہم سب سے خطرناک اور اہم ترین تھی۔

آلوؤں کے تھیلے میں ایک ایسا کاغذ پوشیدہ تھا جو انگلستان کے دارالحکومت لندن کو نہ صرف مکمل تباہی سے بچا سکتا تھا' بلکہ بہت جلد جنگ کا پانسہ بھی اتحادیوں کے حق میں پلٹ سکتا تھا۔ اس کے پاس ایک ایسے منصوبے کا نقشہ تھا جو ہٹلر نے انگلستان پر ہوائی حملوں کے لیے تیار کیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق صرف لندن شہر پر پچاس ہزار بم پھینکنے کا منصوبہ تھا۔ جرمن حکام گزشتہ کئی ماہ سے ان حملوں کی تیاری میں مصروف تھے اور اتحادی اس منصوبے سے بالکل بے خبر........ جرمنوں نے اپنے خفیہ اڈوں کی تعمیر انتہائی راز داری سے کی تھی۔ مزدوروں کی اکثریت جبراً" بھرتی کیے گئے ڈچ اور پولینڈ کے نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ یہ مزدور فرانسیسی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے تھے۔ فرانس میں جرمنوں کے سو سے زائد خفیہ اڈوں کی تعمیر کا کام آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

اتحادیوں میں سے صرف مائیکل ہولارڈ اس خطرناک منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ تھا۔ وہ ناموس وطن کی خاطر ایک مرتبہ پھر اپنے گھر سے نکلا اور سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اپنی منزل قریب دیکھ کر وہ اچانک دوڑنے لگا۔ چند ہی لمحے بعد وہ خار دار تاروں کے اس سلسلے تک جا پہنچا' جو فرانس اور سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ وہ خاردار تار کے قریب کھڑا ہو گیا اور اپنا کلہاڑا اور آلوؤں کا تھیلا دوسری جانب پھینک دیا........ دوسرے ہی لمحے کسی چیز نے اس کے گھٹنے کو آ دبوچا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگ کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ خوف سے کانپنے لگا۔ وہ جرمن پولیس کے ایک خونخوار کتے کی گرفت میں تھا۔

اس نے اپنے آپ کو کتے کے جبڑوں سے چھڑانے کی بڑی کوشش کی' مگر ناکام رہا۔ کتا اس کا گھٹنا منہ میں دبائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ ہولارڈ کو پختہ یقین تھا کہ جرمن سپاہی آس پاس گشت کر رہے ہوں گے اور چند لمحے بعد وہ کتے کی تلاش میں یہاں پہنچ جائیں گے اور اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ وہ موت کے خوف سے لرز گیا۔ اس نے فوری طور پر اپنے آپ کو کتے کی گرفت سے آزاد کرانے اور سرحد کی دوسری طرف کود جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اپنا کلہاڑا پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ اب وہ بالکل نہتّا تھا اور رحم طلب نگاہوں سے کتے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اس کے قریب ہی ایک موٹی سی چھڑی زمین پر پڑی تھی۔ ہولارڈ نے چھڑی اٹھائی اور اسے پورے زور سے کتے کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ ایک منٹ تک زور آزمائی ہوتی رہی۔ آخر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور چند سیکنڈ بعد کتا نیچے لڑھکتا ہوا ایک گہرے کھڈ میں گر گیا۔

اب ہولارڈ تاروں کی باڑ عبور کر کے سوئٹزرلینڈ کی سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے آلوؤں کا تھیلا سنبھالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس کی نظر سوئٹزرلینڈ

کے ایک مسلح سپاہی پر پڑی۔ ایک مرتبہ پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سپاہی نشانہ باندھ رہا تھا،لیکن اس کا ہدف دو جرمن سپاہی تھے' جنھوں نے اپنی بندوقیں ہولارڈ کی طرف تان رکھی تھیں۔ جرمن سپاہیوں نے سوئٹزرلینڈ کے سپاہی کے بگڑے تیور دیکھے تو انھوں نے اپنی بندوقیں گرا دیں اور بڑ بڑاتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اتر گئے۔ ہولارڈ نے تھیلا سنبھالا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چل کھڑا ہوا۔

اسے سرحد عبور کیے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اچانک اتحادیوں کے بمبار طیاروں نے جرمنوں کے خفیہ اڈوں پر بم باری شروع کر دی۔ پانچ ہفتوں کے دوران بہتّر جرمن اڈے اس قدر تباہ و برباد کر دیئے گئے تھے کہ ان سے کسی قسم کا کام لیا جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ جرمنوں نے چند چھوٹے چھوٹے نئے اڈے تعمیر کر لیے' لیکن ان کا لندن کو کھنڈر میں تبدیل کرنے کا منصوبہ خاک میں مل چکا تھا۔ ہٹلر پچاس ہزار کے بجائے صرف ڈھائی ہزار بم انگلستان کی شہری آبادی پر گرانے میں کامیاب ہو سکا۔ جرمن فضائیہ اپنے منصوبے کے مطابق 1943ء کے اواخر میں لندن کو اپنے ہوائی حملوں کا نشانہ بنانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے بَرعکس 1944ء کے وسط میں اِکاؤکا حملے کیے گئے' ان سے بہت معمولی نقصان ہوا۔

اتحادی فوجوں کے سپہ سالار جنرل آئزن ہاور نے اپنی تصنیف ''محاذ یورپ'' میں لکھا ہے۔ ''اگر جرمن اپنے اس خطرناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتے تو یورپ کی فتح اور جرمنوں کا انخلا نہ صرف مشکل' بلکہ ناممکن ہو جاتا''۔

دوسری عالمگیر جنگ کی کہانی کا ایک کردار مائیکل ہولارڈ ہے۔ اس نے ایسی خطرناک مہموں کو سرانجام دینے کا بیڑہ اٹھایا' جنھیں سرکرنے سے پیشہ ور اور تجربہ کار جاسوس بھی انکار کر چکے تھے۔ وہ تین چار سال کے عرصے میں دنیا کا سب سے بڑا جاسوس سمجھا جانے لگا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسے نہ کسی نے جاسوس بننے کے لیے کہا اور نہ اس کی کسی نے راہنمائی کی۔ جاسوسی بننے کا فیصلہ اس نے ضمیر کی آواز

پر کیا اور ناموس وطن کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب اسے کوئی راز یا معلومات اتحادیوں کو پہنچانا ہوتیں تو وہ رات کے پچھلے پہر اپنے مسکن سے نکلتا اور پیدل چلتا ہوا فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر پہنچ جاتا۔ اس نے ہمیشہ یہ پُر خطر سفر تنہا طے کیا۔ اسے کبھی پیراشوٹ سے نہیں گرایا گیا اور نہ اس کے ساتھی اس کی نگرانی کرتے تھے۔ وہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کا درمیانی جنگل بھی وائرلیس کے بغیر عبور کیا کرتا تھا۔

ہولارڈ ایک بھولا بھالا اور وطن دوست انسان تھا۔ اسے محکمۂ جاسوسی میں سب سے کم تنخواہ ملتی تھی، جس سے اس کا گزارہ بھی بمشکل ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا چونکہ اس کام سے اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ جنگ کے دوران جب جرمن دستے پیرس میں گھس آئے تو وہ اس وقت ایک تجارتی ادارے میں ملازم تھا۔ مالکان نے جرمنوں کی پذیرائی کی اور اپنی مصنوعات اور فیکٹری جرمنوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ ہولارڈ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس نے بطورِ احتجاج اس ادارے کی ملازمت ترک کر دی۔ چند روز بعد وہ موٹر گاڑیوں کے گیس سلنڈر تیار کرنے والی ایک مقامی فرم میں ایجنٹ کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اس نے مادرِ وطن کی خدمت اور حفاظت کے لیے جو ارادہ کر رکھا تھا، اس کی تکمیل میں موجودہ ملازمت بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ کچھ عرصے تک وہ خاموشی سے اپنے فرائض کی بجاآوری میں مصروف رہا۔ اسے کوئلے کے لیے لکڑی کی تلاش میں ہفتے میں کئی بار فرانس کے سرحدی جنگلوں کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ چند روز بعد اس کی ملاقات برطانوی جاسوسوں سے ہو گئی، جو عرصے سے جرمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملانے اور ان کے فوجی ٹھکانوں کی ٹوہ لگانے میں مصروف تھے۔

اچانک ایک روز اس نے بھی برطانوی حکومت کو بطورِ جاسوس اپنی خدمات پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنی مہم پر روانہ ہوا تو خوف سے بُری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ ان دنوں سوئٹزرلینڈ کی سرحد کی کڑی

نگرانی کی جاتی تھی۔ جرمن سپاہی ذرا سا شک گزرتے ہی گولی مار دیتے تھے' چنانچہ کسی شخص کو سرحد عبور کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ جرمنوں نے ہولارڈ کو سرحد عبور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ اس سے بہت پوچھ گچھ کی گئی۔ مگر وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔ اس کی تلاشی لی گئی' مگر کچھ برآمد نہ ہُوا۔ آخرکار اسے چھوڑ دیا گیا۔

دوسری مرتبہ وہ سرحد عبور کر کے سوئٹزرلینڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ برطانوی حکام نے اسے فرانس میں جرمن دستوں کی نقل و حرکت اور خفیہ ٹھکانوں سے اتحادی فوجوں کے ہیڈ کوارٹر لو باخبر رکھنے پر مامور کر دیا۔ یہ کام انتہائی کٹھن اور خطرناک ثابت ہُوا' لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور جان جوکھوں میں ڈال کر بھی جرمن دستوں کی ٹوہ لگائی۔

اسے آئندہ مسلسل تین سال تک اپنے گھر سے باہر رہنا پڑا۔ اسے اپنے بیوی بچوں سے بے حد محبت تھی' لیکن اس نے مادرِ وطن کی خاطر اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ اسے کئی ہفتوں کے بعد اپنے بیوی بچوں کو دیکھنے کی مہلت ملتی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں اپنے دروازے پر دستک دیتا اور چند لمحے بعد پھر کسی اور مہم پر روانہ ہو جاتا۔ اس کی بیوی اور ننھے منھے بچے اسے اپنے آنسوؤں سے الوداع کہتے اور ہر وقت اس کی کامیابی کی دعا کرتے رہتے۔ بسا اوقات اسے خدشہ ہوتا کہ اس کی وجہ سے ایک روز اس کے بیوی بچے بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے' اسی خیال کے پیش نظر اس نے اپنے گھر جانا بھی چھوڑ دیا۔

کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی معاونت کے لیے بہت سے فرانسیسی نوجوان بھرتی کر لیے۔ ان میں ٹرک ڈرائیور' ریلوے کے مزدور' خاکروب' ہوٹلوں کے مالک اور بیرے سبھی شامل تھے۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے ساتھیوں کی تعداد ایک سو بیس تک بڑھالی۔ خفیہ اور اہم ترین کاموں کو سرانجام دینے کے لیے پانچ جانبازوں پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا' جس میں ہولارڈ بھی شامل تھا۔ اس کے بیس

ساتھیوں کو جرمن سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔ چند روز بعد انہیں طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ دوسرے بہت سے ساتھی مختلف مہموں کے دوران زخمی ہو گئے۔ چند جانباز بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے دس ساتھیوں نے دشمن کی قید میں خودکشی کر لی۔ اس کے باوجود ان میں سے کسی نے بھی جرمنوں کو اپنی خفیہ تنظیم کے اڈوں اور سرگرمیوں سے آگاہ نہ کیا۔

چند ماہ بعد ہولارڈ ایک تاریک رات میں سوئٹزرلینڈ سے واپس آ رہا تھا۔ اس کے منہ میں جلتا ہُوا سگریٹ تھا۔ اور وہ بڑی شان سے ٹہلتا ہوا جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ وہ سرحد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اچانک درختوں کے جُھنڈ سے کسی جرمن سپاہی نے اسے للکارا۔ ”کون بدمعاش ہے۔ فوراً“ رک جاؤ‘ ورنہ گولی سے اڑا دوں گا“۔

دوسرے ہی لمحے اس نے سگریٹ بجھا دیا اور بجلی کی تیزی سے زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ فرانسیسی علاقے کی سمت رینگنے لگا۔ تین چار گولیاں یکے بعد دیگرے شائیں شائیں کرتی ہوئی آئیں اور اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ جرمن سپاہی نے قہقہہ لگایا اور بوجھل قدم اٹھاتا ہُوا پہاڑی کی دوسری طرف نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔ ہولارڈ اس جنگل کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے جرمن سپاہی کے جانے کے بعد سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ چند لمحے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

ہولارڈ نے انگلستان پر جرمنوں کے ہوائی حملوں کے منصوبے کا سراغ لگانے کے لیے جو کارنامہ سرانجام دیا‘ اس کا آغاز اگست 1943ء میں پیرس کے ایک نواحی قصبے کے ایک قہوہ خانے میں ہُوا۔ اس کی خفیہ تنظیم کا ایک کارکن اس قہوہ خانے میں آنے والوں کی نگرانی پر متعین تھا۔ اچانک ایک روز اس نے ہولارڈ کو اطلاع دی۔

”آج میں نے چند آدمیوں کو سرگوشی کرتے سنا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جرمن اس قصبے کے نواح میں ایک عجیب و غریب عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ جس میں خلاف

معمول بہت زیادہ مقدار میں کنکریٹ استعمال کی جا رہی ہے۔"

ہولارڈ ایک روز صبح سویرے پادریوں کے بھیس میں اسی قصبے کے دفتر روزگار میں پہنچ گیا۔ اس نے دفتر کے منتظم سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ ایک پروٹسٹنٹ تنظیم کا نمائندہ ہے جو مزدوروں کی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین تصور کرتی ہے۔ اس کے بعد اس نے انجیلِ مقدس کے تین نسخے منتظم کو پیش کیے اور پوچھا کہ آس پاس کوئی تعمیراتی کام تو نہیں ہو رہا۔ منتظم بڑا سیدھا سادھا انسان تھا۔ فوراً" بول اٹھا۔ "جناب' مغرب کی جانب بیس میل کے فاصلے پرُ اونے' میں ایک بہت بڑی عمارت زیرِ تعمیر ہے۔ وہاں سینکڑوں مزدور دن رات کام کر رہے ہیں۔"

وہ ایک گھنٹے بعد مزدوروں کی نیلے رنگ کی وردی پہن کرُ اونے' پہنچ گیا۔ اس قصبے سے چار سڑکیں مختلف اطراف کو جاتی تھیں۔ اس نے تین سڑکوں پر دور دور تک نگاہ دوڑائی مگر کچھ نظر نہ آیا۔ اسے چوتھی سڑک پر چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ایک چٹیل میدان دکھائی دیا' جہاں بہت سے مزدور کنکریٹ ملانے اور دوسرے تعمیراتی کاموں میں مصروف تھے۔ ہولارڈ کو سینکڑوں مزدوروں کی موجودگی اور کام کی رفتار سے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے کسی اہم عمارت کی تعمیر کی جا رہی ہے۔

اس نے بھی پہیوں والی ایک ریڑھی سنبھالی اور اس میں کنکریٹ بھرنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ اسے دھکیلتا ہُوا دوسرے مزدوروں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ بار بار کنکھیوں سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتا لیکن جلدی ہی اپنی نظریں جھکا دیتا اور کام میں مصروف ہو جاتا۔ اسے خلافِ توقع کسی نے نہ پہچانا اور نہ روکا۔ وہ دن بھر دوسرے مزدوروں کے شانہ بشانہ کام کرتا رہا۔ تمام مزدوروں کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت تھی۔ ان میں سے بیشتر مزدور فرانسیسی زبان کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ چند مزدور' جو ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی بول سکتے تھے' انہوں نے سرگوشی کے انداز میں ہولارڈ کو بتایا کہ وہ ایک بہت بڑا گیراج تعمیر کر رہے ہیں' لیکن اسے اس میں کوئی حقیقت نظر نہ آئی۔ یہ عمارت ایک گیراج کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ پھر یہ کہ

بڑے بڑے فرانسیسی شہروں سے اس قدر دور گیراج تعمیر کرنے میں بظاہر کوئی مصلحت بھی نظر نہ آتی تھی۔

وہ اس عمارت سے چند قدموں کے فاصلے پر پچاس گز لمبی ایک پکی سڑک دیکھ کر چونک گیا۔ سڑک کے دونوں طرف گہرے نیلے رنگ کی موٹی موٹی لکیریں کھینچ دی گئی تھیں۔ اس نے بہت ہی کوشش کی، مگر یہ معما حل نہ کر سکا۔ آخر کار اس نے اپنا قطب نما نکالا اور زمین پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا۔ چند لمحے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ عمارت جرمن فضائیہ کا ایک خفیہ اڈہ ہے اور اس سڑک کا رخ عین لندن کی طرف ہے۔ جرمن حکام اس عمارت کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے مزدوروں سے تین مختلف شفٹوں سے کام لیتے تھے اور یہ تعمیراتی کام گزشتہ کئی روز سے دن رات جاری تھا۔ اسی روز وہ شام کے دھندلکے میں برطانوی ہیڈ کوارٹر کو مطلع کرنے کے لیے چپکے سے کھسک گیا۔

لندن میں اتحادی طاقتوں کے سربراہ جرمن دستوں کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان میں سر ونسٹن چرچل اور جنرل آئزن ہاور بھی شامل تھے۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے جرمنوں کی سرگرمیوں اور منصوبوں کے متعلق اطلاعات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ برطانوی فضائیہ نے پائلٹ کے بغیر جو ہوائی جہاز دشمن کے مورچوں کی تصاویر کھینچنے کے لیے اڑایا تھا، وہ بخیر و خوبی اپنے اڈے پر واپس پہنچ گیا۔ اس تصاویر سے جرمنوں کے خفیہ ٹھکانوں کا جو سراغ ملا، اس سے مناسب راہنمائی ملنی نہ صرف دشوار، بلکہ ناممکن تھی۔ چند روز بعد اتحادیوں کے ہیڈ کوارٹر میں بورف ہام سے اطلاع موصول ہوئی کہ وہاں ایک عجیب و غریب ہتھیار کے شکستہ ٹکڑے ملے ہیں جو آسمان سے گرا تھا۔ اس ہتھیار کے ٹکڑے تجزیئے کے لیے برطانوی وزارت جنگ کی تجربہ گاہ میں بھیج دیئے گئے۔ اتحادیوں کا خیال تھا کہ چند دنوں کے اندر اندر جرمنوں کی طرف سے ایک اور بھرپور حملہ کیا جائے گا اور اس حملے میں دشمن اپنے مہلک ترین ہتھیاروں کو بروئے کار لائے

گا۔ اتحادی، دشمن کے اس منصوبے کی تفصیلات جاننے کے لیے بہت بے چین تھے، لیکن یہ کام ان کے بس کا نہ تھا۔ جرمن اپنے خفیہ فوجی اڈوں کی تعمیر کا کام انتہائی راز داری اور تیزی کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے۔

اس کسمپرسی کے عالم میں ہولارڈ کی معلومات مژدۂ جاں فزا ثابت ہوئیں۔ فوراً ہی اسے اتحادیوں کے ہیڈ کوارٹر سے جواب ملا کہ وہ تمام مصروفیات ملتوی کر کے اپنی توجہ ان خفیہ عمارتوں پر مرکوز کر دے۔

ہولارڈ اگلے روز سپیدہ صبح نمودار ہوتے ہی اپنے چار جاں باز ساتھیوں کو لے کر سائیکلوں پر شمالی فرانس کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ انہوں نے تین ہفتے میں بیسیوں لوگوں سے بات چیت کر کے اور مختلف ہوٹلوں میں قیام کر کے دشمن کے ساٹھ خفیہ اڈوں کا سراغ لگایا۔ وہ نومبر کے وسط تک مزید چالیس اڈوں کی ٹوہ لگا چکے تھے۔ تمام اڈے دو سو میل لمبے اور تیس میل چوڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور فرانسیسی ساحل کے ساتھ ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔ ان سب کا ہدف لندن تھا۔ لیکن ابھی تک یہ عمارتیں ہولارڈ کے لیے معما بنی ہوئی تھیں۔

بسا اوقات جاسوسی کے پیشے میں جاسوس کی اپنی قسمت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہولارڈ بھی بہت خوش قسمت واقع ہوا۔ اسے اس قدر حسنِ اتفاقات سے پالا پڑا کہ وہ ہٹلر کا خطرناک منصوبہ بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک روز ہولارڈ اپنے ایک ساتھی سے مصروف گفتگو تھا۔ یہ شخص اپنے ایک دوست کی سفارش کرنے کے لیے اس کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس نوجوان کا نام رابرٹ تھا اور وہ دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لینا اپنا فرض تصور کرتا تھا۔ ہولارڈ نے اسے ایک ہوائی اڈے کی نگرانی پر مامور کر دیا۔

چند روز بعد رابرٹ نے اپنے ایک اور فرانسیسی دوست اینڈری کو مجبور کر کے ہولارڈ کی خفیہ تنظیم میں داخل کرا دیا۔ اینڈری کو بائس کار کے مقام پر تعینات کر دیا گیا جہاں جرمنوں کے ایک اور خفیہ فضائی اڈے کی تعمیر کا کام بڑی تیزی کے ساتھ

جاری تھا۔ وہ بھی مزدوروں میں شامل ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد اس نے ہولارڈ کو اطلاع دی۔

"جرمنوں کے ایک خطرناک اور اہم منصوبے کے کاغذات میرے ہاتھوں سے گزرے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک معاہدے پر دستخط کرا لیے ہیں کہ اگر میں نے کسی شخص کو اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو مجھے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

ہولارڈ کو اپنے مادرِ وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ اس نے سینکڑوں فرانسیسی نوجوانوں کو حبُ الوطنی کے نام پر اپنی تنظیم میں شامل کیا تھا۔ اس کی تنظیم کا ہر رکن اس کے اشارے پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ ہولارڈ کے تمام ساتھی اس کے احکام کی بجا آوری اپنا فرضِ اولیں تصور کرتے تھے' لیکن اسے اینڈری کی اطلاع نے بہت پریشان کیا آخر کار ہولارڈ نے اسے مندرجہ ذیل ہدایات ارسال کر دیں۔

"مسیو اینڈری' ہر قیمت پر اس منصوبے کی ایک نقل حاصل کی جائے۔ اگر آپ یہ کام سرانجام دینے سے قاصر رہے تو آپ کے ساتھ اس بزدل سپاہی کا سا سلوک کیا جائے گا' جو عین لڑائی کے وقت اپنے ساتھیوں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا ہو۔"

اینڈری نے ہولارڈ کی ہدایات موصول ہوتے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ جان پر کھیل کر بھی یہ راز حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ بائس کار میں مقیم جرمن مہم کا سربراہ ہمیشہ اس منصوبے کا نقشہ اپنے اوور کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتا تھا اور کوٹ دن بھر پہنے رکھتا۔ وہ ہر روز نو بجے اپنی خواب گاہ سے نکلتا اور غسل خانے میں جانے سے پہلے اوور کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیتا۔ اینڈری نے مسلسل کئی روز تک جرمن افسر پر کڑی نگاہ رکھی۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ غسل خانے میں تین سے پانچ منٹ تک رہتا ہے۔

اچانک ایک روز جرمن افسر نے حسبِ معمول اپنا اوور کوٹ اتار کر کھونٹی پر

لٹکایا اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے اینڈری دبے پاؤں کمرے میں گھسا۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے نقشہ نکالا اور جلدی جلدی اس کی ایک نقل تیار کر لی۔ وہ جرمن افسر کے واپس آنے تک اپنے کام پر واپس پہنچ چکا تھا۔

اس نے ہفتے کے آخر میں ہولارڈ کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اس کی بھیجی ہوئی دوا نگل لی۔ چند لمحے بعد اسے معدے میں شدید درد محسوس ہونے لگا۔ وہ بلبلا اٹھا اور چیخنے چلانے لگا۔ اس نے جرمن ڈاکٹر سے فریاد کی' مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ تھوڑی دیر بعد جب اینڈری کو قے ہوئی تو ڈاکٹر نے اسے چند دن کے لیے پیرس جا کر اپنے خاندانی معالج سے علاج کرانے کی اجازت دے دی۔

اگلے دن ہولارڈ اور اینڈری پیرس کے ایک شکستہ مکان میں اس نقل کو مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ اس نقشے کو مختلف حصوں میں منقسم دکھایا گیا تھا۔ انہوں نے کئی بار ان کو ملایا' لیکن بڑی دیر تک سر کھپانے کے باوجود ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر کار انہوں نے ایک مرتبہ پھر ان کی ترتیب بدل دی۔ دوسرے ہی لمحے ان کے سامنے فرانس میں جرمنوں کے تمام خفیہ ہوائی اڈوں کا نقشہ بن چکا تھا' جس کے درمیان میں ایک بہت بڑے بم کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔

جب ہولارڈ کو فرانس اور سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر سراغ رساں کتے نے آ دبوچا' اس وقت یہ نقشہ ایک آلو کے اندر پوشیدہ تھا۔ اس نے سوئٹزر لینڈ پہنچتے ہی برطانوی حکومت کو جرمنوں کے اس خطرناک منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد برطانوی وزارت جنگ کے دفتر کی طرف سے برقیہ موصول ہوا۔

"آپ کا ارسال کردہ تحفہ مل گیا۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔"

اب ہولارڈ اپنے پیشے سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ گزشتہ کئی سال سے خطروں سے کھیل رہا تھا۔ کئی بار دشمن نے اسے گرفتار کیا' لیکن وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے رہا ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسے کئی موقعوں پر دشمن کے مورچوں میں بھی جا کر

معلومات حاصل کرنا پڑیں۔ اسے ہر وقت پکڑے جانے کا خدشہ رہتا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے بیوی بچوں کے پاس جانا چھوڑ دیا تھا۔ برطانوی حکام مصر تھے کہ وہ سوئٹزر لینڈ ہی میں رہے اور مزید ہدایات کا انتظار کرے۔

چند روز وہ سوئٹزر لینڈ میں اپنے ایک دوست کے ہاں دبکا بیٹھا رہا۔ اس اثناء میں اس کی تنظیم کے ایک رکن نے اطلاع دی کہ فرانسیسی سٹیشن ماسٹر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمن کی فوجی گاڑیوں کی تفصیلات نوٹ کر رہے ہیں۔ کئی فرانسیسی جاں بازوں کو گرجوں' بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر جرمنوں کی نگرانی کرتے دیکھا گیا ہے اور دشمن کے کئی فوجی ٹھکانوں پر دھماکوں کی اطلاعات بھی موصول ہوئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرانسیسی قوم بیدار ہو گئی ہے اور اس نے دشمن سے برسرِ پیکار ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔

ہولارڈ کی مہم جو طبیعت پھر مچلنے لگی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آخری دم تک اپنے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے کوشاں رہے گا۔

چند روز بعد اس نے رات کی تاریکی میں فرانس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس نے اپنی تنظیم کے کارکنوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لیکن وہ جلدی ہی اپنے ایک دوست کی بے وقوفی کی بنا پر اپنی تنظیم کے تین جاں بازوں کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے ایک کارکن دو روز بعد قیدیوں کے کیمپ میں ہلاک ہو گیا۔ دوسرے ساتھیوں کو تین ماہ بعد رہا کر دیا گیا' لیکن دشمن نے ہولارڈ کو سخت اذیتیں دیں۔ شروع میں اسے مسلسل آٹھ دس روز تک کوڑے کھانا پڑے۔ کبھی اسے دریا میں غوطے دیئے جاتے اور کبھی اس کے چہرے پر انتہائی سرد پانی کے چھینٹے مارے جاتے جس سے اس کے سر میں شدید درد ہونے لگتا۔ کئی مرتبہ اس کے ہاتھ پاؤں شکنجے میں کس دیئے گئے۔ اس نے مسلسل جرمنوں کے ظلم و ستم سہے' لیکن اتحادیوں کا کوئی راز فاش نہ کیا۔ دشمن اسے کسی سازش میں شریک ثابت نہ کر سکا۔ اس کے باوجود اسے رہا کرنے کے بجائے نیو نگھم میں قیدیوں کے کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔

ہولارڈ کو جنگ بندی سے چند روز قبل سینکڑوں جنگی قیدیوں کے ہمراہ کیمپ سے نکال کر بحری جہازوں کے تنگ و تاریک تہہ خانوں میں بند کر دیا گیا۔ جرمنوں کو پختہ یقین تھا کہ اتحادی ان جہازوں پر ضرور حملہ آور ہوں گے۔ اس طرح یہ جہاز ان ہی کے ہاتھوں غرقاب ہو جائیں گے۔ ایک روز اچانک جہازوں کو شمال کی سمت روانہ ہونے کا حکم دے دیا گیا' لیکن اسے عین آخری مرحلے پر سویڈن کے ایک ریڈکراس جہاز میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ سویڈن کے ایک ہسپتال میں چھ ہفتے گزارنے کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔

ایک خنک صبح برطانوی فضائیہ کا ایک جہاز ہولارڈ کو لندن لے جانے کے لیے سویڈن کے ہوائی اڈے پر اترا' جہاں اسے برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا جانے والا تھا' لیکن وہ جہاز کی آمد سے چند ہی لمحے قبل اپنے مادرِ وطن کو روانہ ہو چکا تھا۔ جب اس کا جہاز 'اونے' کے اوپر سے گزرا تو صبح آزادیٔ طلوع ہو چکی تھی اور اسے جرمنوں کے خفیہ اڈے کے کھنڈر واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

*

پارکر پاین کا پہلا کارنامہ

میجر ولبراہام جب بھی اخبار میں مختصر اشتہارات پر نظریں دوڑاتا تو ہمیشہ ایک دو سطری اشتہار پر اس کی نظریں گڑ جاتیں۔ اس اشتہار کا مستقل طور پر ایک ہی مضمون تھا۔

"کیا آپ پُر مسرت زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو 17۔ رچمنڈ سٹریٹ میں مسٹر پارکر پائن سے مشورہ کیجیے۔"

آخر ایک دن میجر ولبراہام 17۔ رچمنڈ سٹریٹ میں مسٹر پارکر پائن سے مشورہ کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ پر مسرت زندگی بسر کر رہا تھا؟

پارکر پائن کا آفس کوئی خاص بڑا نہ تھا۔ ایک سال خوردہ عمارت کے دو کمرے' جن کی دیواروں پر سالہا سال سے کائی جمی ہوئی تھی۔ لکڑی کے دروازے پر لکھا تھا۔ "آفس۔ براہ کرم دستک دیے بغیر اندر چلے آیئے۔" میجر ولبراہام ایک لمحے کے لیے اندر جاتے ہوئے جھجکا۔ نہ معلوم یہ شخص پارکر پائن کس قسم کا دھندا کرتا ہے۔ یقیناً کوئی ٹھگ یا شعبدے باز ہو گا۔ دیکھنا چاہیے۔ لمبا سانس بھرتے ہوئے میجر ولبراہام نے

آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہوا۔ ٹائپ کرتی ہوئی ایک خاتون نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں میجر کی طرف دیکھا۔

"کیا مسٹر پارکر پائن تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ آئیے۔" خاتون نے مہذب لہجے میں جواب دیا اور ایک اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں چلے جائیے۔ مسٹر پائن موجود ہیں۔"

میجر ولبراہام جب اس کمرے میں گیا تو ادھیڑ عمر کا ایک دبلا پتلا شخص کرسی سے اٹھ کر اس کے استقبال کو آیا اور مصافحہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹھیے جناب' میرا نام پارکر پائن ہے۔"

میجر ولبراہام نے پیشانی پر پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ولبراہام کہتے ہیں۔"

"میجر یا کرنل؟" مسٹر پائن نے پوچھا۔

"میجر۔"

"خوب۔ خوب۔ معلوم ہوتا ہے آپ حال ہی میں کسی بیرونی سفر سے واپس آئے ہیں۔ شاید ہندوستان یا مشرقی افریقہ سے؟"

"مشرقی افریقہ سے۔"

"بہت خوبصورت ملک ہے۔" مسٹر پائن نے کہا۔ "بہرحال آپ وطن واپس آگئے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ مطمئن نہیں ہیں۔"

"بے شک آپ کا اندازہ درست ہے۔" میجر ولبراہام نے اقرار کیا۔ "لیکن میں نہیں سمجھا کہ آپ کو یہ کیوں کر علم ہوا کہ میں بیرونی سفر سے واپس آیا ہوں اور میرا تعلق فوج سے رہا ہے۔"

"آہ۔۔ چھوڑیے چھوڑیے۔۔ یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ مجھے کیوں کر علم ہوا۔ میں نے اپنی زندگی کے 35 برس ایسے محکمے میں گزارے ہیں جہاں دن رات ہزاروں

لوگوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس طویل ملازمت کے دوران میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے ملک میں کم از کم چھیانوے فی صد افراد ایسے ہیں جو موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ریٹائر ہونے کے بعد ان لوگوں کو خوشیاں بہم پہنچاؤں گا اور میں بے حد کامیاب ہوں۔ میری حیثیت اس وقت ایک معالج کی سی ہے۔ ایسا معالج جو غمزدہ لوگوں کے مسائل کا صحیح تجزیہ کر کے بہترین علاج پیش کرتا ہے۔ میں نے آج تک جتنے کیس بھی لیے ہیں' سب میں کامیاب رہا ہوں اور اگر کوئی ناقابل علاج کیس میرے پاس آتا ہے تو میں صاف انکار کر دیتا ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اب فرمایئے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟"

میجر ولبراہام نے مسٹر پائن کی تقریر غور اور دلچسپی سے سنی۔ پھر کہا۔

"میں اپنی زندگی کی یکسانیت سے اکتا چکا ہوں۔ میرے پاس روپیہ اچھا خاصا جمع ہو چکا ہے۔ پنشن بھی معقول ہے۔ ہر طرح کی آسائش اور آرام بھی مجھے میسر ہے۔ کوب ہام کے نزدیک ایک چھوٹے سے حسین گھر کا مالک ہوں۔ میرے پڑوسی بھی سب کے سب اچھے اور شریف لوگ ہیں۔ بظاہر میری زندگی میں کوئی غم نہیں' کوئی دکھ نہیں مگر پھر بھی میں نالاں ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ ابھی تک کنوارے ہیں؟" مسٹر پائن نے کہا۔

اس سوال پر میجر ولبراہام کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے جواب دیا!

"مسٹر پائن' آپ دیکھتے ہیں کہ میں جوانی کی حدوں سے گزر چکا ہوں اور اب تیزی سے بڑھاپے کی طرف جا رہا ہوں۔ میری زندگی کا المیہ یہ ہے کہ آج تک کسی نے مجھ پر ہمدردی یا محبت کی نظر نہیں ڈالی۔"

اس کا لہجہ اتنا یاس انگیز اور تلخ تھا کہ پارکر پائن متاثر ہوئے بغیر نہ رہا لیکن اس نے مسکرا کر کہا:

"ارے صاحب' اتنی مایوسی کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ دنیا بے حد رنگین اور

خوبصورت ہے۔ یہاں قدم قدم پر خوشگوار حادثے ہیں۔ ممکن ہے آپ بھی کسی کی نظر میں سما جائیں۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آپ کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لیے جو راستہ میں تجویز کروں گا' اس میں خطرے بھی پوشیدہ ہیں۔ کیا آپ ان خطروں سے کھیلنا پسند کریں گے؟"

میجر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے کسی قدر جوش سے کہا۔

"میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں......... مگر یہ تو بتائیے آپ کی فیس کیا ہے؟"

"صرف پچاس پونڈ اور وہ بھی پیشگی۔ اگر ایک ماہ بعد آپ مجھے بتا دیں کہ آپ کی زندگی پہلے کی طرح گزر رہی ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں پڑا تو یہ رقم میں بخوشی آپ کو واپس کر دوں گا۔"

میجر ولبراہام نے چند لمحے اس شرط پر غور کیا' پھر کہا۔

"بہت بہتر، میں آپ کو پچاس پونڈ مالیت کا چیک دے دیتا ہوں۔"

اس نے جیب سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر جونہی مسٹر پارکر پائن کے حوالے کیا اس نے میز پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور میجر سے کہا۔

"دیکھیے اب دوپہر کا ایک بجا ہے۔ میں آپ کو ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے ساتھ ایک خاتون کو کسی اچھے ریستوران میں لنچ پر لے جائیے۔"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک دراز قد نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا لباس فیشن ایبل تھا اور چال ڈھال سے نفاست ٹپکتی تھی۔ پارکر پائن نے تعارف کراتے ہوئے کہا:

"مس سارا' ان سے ملئے۔ ہمارے دوست میجر ولبراہام۔ ان کا انتہائی کرم ہے کہ یہ آپ کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ کیا آپ ان کے ساتھ جائیں گی۔"

"میرے لیے یہ بڑا اعزاز ہے مسٹر پائن۔" مس سارا نے مسکرا کر کہا۔ میجر

ولبراہام اٹھ کھڑا ہوا۔ پارکر پائن نے اس سے کہا۔
"آپ کا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ کل صبح میری جانب سے آپ کو مزید ہدایات مل جائیں گی۔ اب آپ دونوں جا سکتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

اسی روز تین بجے سہ پہر مس سارا واپس مسٹر پارکر پائن کے دفتر میں آئی۔ اس نے پوچھا:
"سنائیے' کیا رائے ہے آپ کی میجر ولبراہام کے بارے میں۔"
مس سارا نے مایوسی سے گردن نفی میں ہلائی اور کہا:
"وہ تمام وقت مجھ سے ڈرا ڈرا سہما سہما رہا۔"
"میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ تم نے میری ہدایات پر پورا پورا عمل کیا تھا؟"
"جی ہاں۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ وہ ایسی شریک حیات چاہتا ہے جو بہت زیادہ خوبصورت ہو نہ بدصورت۔ اس کی آنکھیں نیلی' بال سرمئی مائل بھورے' جسم دبلا نہ موٹا اور قد درمیانہ ہونا ضروری ہے۔"
"میرا خیال ہے اس حلیئے کی خاتون تلاش کرنے میں کچھ زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑے گی۔" پارکر پائن نے کہا۔ "ممکن ہے ہمارے "سٹاک" ہی میں سے نکل آئے۔ براہ کرم شیڈول بی میرے پاس لے آئیے۔"
پارکر پائن نے چند لمحے تک ایک فائل کی ورق گردانی کی' پھر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا:
"فریڈا کلیگ......... غالباً" یہ لڑکی بہت مناسب ہے......... اب مجھے مسز اولیور سے سب معاملہ طے کر لینا چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

اگلے روز صبح نو بجے میجر ولبراہام کو پارکر پائن کی جانب سے ایک کاغذ ملا جس

میں لکھا تھا:

"پیر کے روز ٹھیک گیارہ بجے آپ نمبر ۱۲ رفریئرلین (ہمپسٹڈ) پہنچ جائیے اور وہاں مسٹر جونز نام کے ایک صاحب سے ملئے۔ انہیں صرف اتنا بتائیے کہ آپ گیواشپنگ کمپنی کے نمائندے ہیں۔ بقیہ گفتگو وہ خود کریں گے۔"

میجر ولبراہام نے کئی بار اس پراسرار ہدایت پر غور کیا' مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ آخر پیر کے روز وہ صبح سویرے گھر سے نکلا اور فریئرلین کی جانب روانہ ہوا۔ مگر........ وہ وہاں نہ پہنچ سکا کیونکہ راستے ہی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس روز اسے یوں محسوس ہوا جیسے لندن کے تمام لوگ ہمپسٹڈ کی جانب چلے جا رہے ہیں۔ غالباً" آج کوئی چھٹی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ وہ زیر زمین چلنے والی ریل کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا اور اس سے پیشتر لندن کے اس علاقے میں کبھی نہ آیا تھا۔ ریل میں بڑی بھیڑ تھی۔ اس نے کئی آدمیوں سے رفریئرلین کا پتہ پوچھا۔ مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ آخر وہ ایک ویران سے سٹیشن پر اتر گیا۔ ریلوے کے ایک ملازم نے اسے بتایا تھا کہ کچھ فاصلے پر فریئرلین نام کی بستی واقع ہے۔ بہت دیر تک وہ ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ گیارہ بجنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ مکانوں کے دروازوں پر لگی ہوئی تختیاں پڑھ پڑھ کر وہ عاجز آ چکا تھا اور نمبر ۱۲۔فریئرلین کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دفعتہ" اس کے کانوں میں کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ چوکنا ہو کر اردگرد دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی ذی روح نہ تھا' اتنے میں آواز دوبارہ آئی اور اس مرتبہ میجر ولبراہام نے "بچاؤ بچاؤ" کے الفاظ بخوبی سنے۔ پھر دو تین چیخیں بھی بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں اس مکان کے اندر سے آ رہی تھیں جو میجر ولبراہام کے بالکل سامنے تھا۔ ایک لمحہ تامل کیے بغیر وہ دوڑا اور مکان کا آہنی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہر طرف خود رو پودے اور جھاڑ جھنکار کثرت سے اگا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وسیع لان میں دو آوارہ نوجوان ایک لڑکی کو پکڑے ہوئے ہیں اور وہ آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی ہے۔ ایک نے لڑکی کا منہ سختی سے بند کر رکھا تھا اور دوسرا

اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کی پشت میجر ولبراہام کی طرف تھی اور وہ اپنی اس کارروائی میں ایسے مصروف تھے کہ انہوں نے کسی کے آنے کی آہٹ بھی نہ سنی۔

میجر ولبراہام کا پہلا گھونسا اس بدمعاش کی گردن پر پڑا جس نے لڑکی کا منہ دبا رکھا تھا۔ دوسرا گھونسا جبڑے پر، تیسرا پیٹ میں۔ میجر اچھا باکسر تھا اور اس نے اپنے حریفوں کو دم لینے کی بھی مہلت نہ دی۔ چند منٹ کی زبردست لڑائی کے بعد دونوں بدمعاش وہاں سے بے تحاشا بھاگ نکلے۔ میجر ان کے تعاقب میں لپکا، مگر وہ "آنا" فانا" نظروں سے غائب ہو گئے۔

لڑکی نہایت حواس باختہ ایک طرف کھڑی بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے دانتوں سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھر گئے تھے۔ میجر نے اس کے نزدیک پہنچ کر کہا:

"گھبرایئے نہیں، وہ بھاگ گئے ہیں۔"

"اگر آپ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو وہ نہ جانے میرا کیا حال کرتے۔ آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔ آپ نے میری عزت بچائی۔" لڑکی نے کہا۔ اب میجر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر بائیس تیئس سال سے زائد نہ تھی۔ نیلی آنکھیں، سرمئی بال، درمیانہ قد اور چہرے کے نقوش نہایت معصوم اور سادہ۔ اس نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کے چیخنے کی آواز کان میں آئی۔ بہتر یہ ہے کہ ہم جلد یہاں سے نکل چلیں۔ ممکن ہے وہ کچھ اور بدمعاشوں کو لے کر واپس آ جائیں۔"

لڑکی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے میجر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب وہ نہ آئیں گے۔ آپ نے مار مار کر ان کا کچومر نکال دیا۔ آپ بڑے بہادر اور جی دار آدمی ہیں۔"

میجر دلبراہام کے جسم میں چلوؤں خون بڑھ گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی صنف نازک نے اس کی تعریف میں ایسے الفاظ کہے۔ اس نے خاکسارانہ انداز میں گردن جھکاتے ہوئے کہا:

"میں بھلا کس قابل ہوں' آیئے اب چلیں اگر آپ چاہیں تو میرے بازو کا سہارا لے سکتی ہیں۔"

لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ میجر دلبراہام کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ وہ لڑکی کو سہارا دے کر مکان سے باہر لایا۔ وہ ابھی تک بدحواس تھی۔ اس نے مڑ کر اس مکان کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"تعجب ہے اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔ نہ جانے کب سے خالی پڑا ہے۔" پھر اس نے دروازے پر لگی ہوئی تختی کو دیکھا اور کہا۔ "بلا شبہ یہی مکان ہے وائٹ فریئرز۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یہیں تو آنا تھا۔۔۔۔۔۔۔"

"اب چھوڑیے اس مکان کے قصے کو۔" دلبراہام نے کہا۔ "خدا کرے کوئی خالی ٹیکسی مل جائے تو میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں' مگر اس سے پہلے آپ کو میرے ساتھ کسی ریستوران میں قہوے کی ایک پیالی ضرور پینا پڑے گی۔"

وہ تھوڑی دور پیدل چلے۔ پھر ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ راستے میں میجر نے کہا:

"معاف کرنا میں اپنا نام بتانا تو بھول ہی گیا۔ مجھے دلبراہام کہتے ہیں۔"

"اور میرا نام فریڈا کلیگ ہے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دس منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اترے اور ایک چھوٹے سے ریستوران میں داخل ہوئے۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر انہوں نے قہوے کا آرڈر دیا۔ مس فریڈا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"خدا کی پناہ' اس حادثے کو میں زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔۔۔"

"ارے صاحب' آپ بھول بھی جایئے اس تکلیف دہ قصے کو۔" دلبراہام نے

کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ اپنا تفصیلی تعارف کرا دیں۔"

لڑکی کے چہرے پر اداسی اور غم کے گہرے اثرات نمودار ہوئے۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا:

"مسٹر ولبراہام' میرے تفصیلی تعاف میں آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ خوامخواہ آپ کو کوفت ہو گی مگر ارشاد کی تعمیل میں عرض کرتی ہوں کہ اس بھری دنیا میں کوئی فرد ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں یا سمجھ سکوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میجر ولبراہام اس کی یہ حالت دیکھ کر ازحد متاثر ہوا۔ اس نے جھٹ سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اور ہمدردی سے کہا:

"میں معافی چاہتا ہوں' مجھے علم نہ تھا کہ آپ اس قدر مصیبت زدہ ہیں۔"

مس کلیگ نے اپنی کہانی کچھ اس طرح سنائی۔

"جب میں آٹھ سال کی تھی تو میرا باپ مرگیا۔ وہ کسی بحری جہاز کا کپتان تھا۔ میری ماں نے مجھے بڑی محبت سے پالا اور محض میری خاطر دوسری شادی نہ کی۔ ابھی تین سال قبل میری ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب دنیا میں میرا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں ہے۔ ایک گیس کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ گزشتہ ہفتے کا ذکر ہے میں شام کو دفتر سے نکل کر جب گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص میرا منتظر ہے۔ اس کا نام مسٹر ریڈ تھا اور وہ ملبورن میں وکالت کرتا تھا۔ اس نے نہایت خوش اخلاقی اور احترام سے باتیں شروع کیں۔ میرے والد کے بارے میں کئی سوال کیے' پھر کہنے لگا کہ وہ میرے والد کو بہت عرصے سے جانتا ہے اور ان کا قانونی مشیر بھی رہ چکا ہے۔ آخر اس نے نہایت سنجیدہ صورت بنا کر کہا:

"مس کلیگ' کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کے والد نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ایک خاص وصیت نامہ مرتب کیا تھا جس کی رو سے ان کے مرنے کے بعد تمام جائداد کی مالک آپ ہیں؟"

"وکیل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرے بدن میں تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا:

"جناب ' مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے کبھی اپنے والد کے پرانے کاغذوں یا دستاویزات کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ میری والدہ یہ تمام کاغذ ایک پرانے لکڑی کے صندوق میں بند رکھا کرتی تھیں۔"

"کیا وہ کاغذات ابھی محفوظ ہیں یا ضائع کر دیے گئے؟" وکیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کاغذات تو موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی والدہ کے انتقال کے بعد میں نے ایک روز یہ صندوق کھولا تھا' مگر مجھے تو اس میں کوئی وصیت نامہ وغیرہ دکھائی نہ دیا اور نہ کوئی ایسا کاغذ جس سے والد کی جائداد کا کچھ پتہ چل سکتا تھا۔"

یہ سن کر وکیل نے سر کو جنبش دی اور کہنے لگا۔ "مس کلیگ' یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی نظر سے یہ قیمتی کاغذات گزرے ہوں' مگر آپ ان کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکی ہوں۔ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے یہ کاغذات دکھائیے۔"

میں نے صندوق کھول کر کاغذوں کا وہ پلندا نکالا اور وکیل کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چند منٹ تک بعض کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا' پھر کہنے لگا۔

"مس کلیگ' یہ کاغذ تو بہت ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے والد نے اپنے خاص خفیہ الفاظ میں انہیں مرتب کیا ہے۔ اس عبارت کو حل کرنے کے لیے خاصا وقت چاہیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ پلندا اپنے ساتھ لے جاؤں اور اطمینان سے دیکھوں۔ پھر چند روز بعد میں آپ سے ملنے آؤں گا۔"

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہفتے کے روز آخری ڈاک سے مجھے اس کا ایک خط ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ اگر آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تو نہایت کرم ہو گا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

"میرا پتہ یہ ہے: وائٹ فریئرز۔ فریئر لین ہمپسٹڈ۔ پیر کے روز ٹھیک پونے گیارہ

بجے پہنچ جائیے۔"

"چنانچہ آپ پہنچ گئیں۔ آج پیر کا دن ہے۔" ولبراہام نے کہا:

"جی ہاں۔ وکیل کا یہ خط پا کر میں خوش ہوئی اور سوچنے لگی کہ اس نے ضرور کوئی خاص بات ان کاغذوں سے معلوم کر لی ہے۔ بہرحال میں ہمپسٹڈ کے علاقے میں گئی اور دیر تک اس مکان کو ڈھونڈتی رہی۔ بہت دیر بعد اس کا پتہ چلا اور جونہی میں اندر داخل ہو کر لان کے قریب پہنچی' دو آوارہ نوجوان جو وہیں چھپے ہوئے تھے' میری طرف لپکے اور انہوں نے مجھے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی۔ ایک نے میرا منہ سختی سے بند کر رکھا تھا تاکہ میں آواز نہ نکال سکوں' مگر پھر بھی میری آواز آپ کے کانوں تک پہنچ گئی........ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔"

"کیا آپ نے ان دونوں بدمعاشوں کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا؟" ولبراہام نے پوچھا۔

لڑکی نے نفی میں گردن ہلائی۔ میجر ولبراہام نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا:

"بہرحال اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی شخص تمہارے مرحوم والد کے ذاتی کاغذات میں دلچسپی رکھتا ہے اور اسی نے اس وکیل کو اس کام پر مقرر کیا۔ ممکن ہے یہ وکیل ہی وہ آدمی ہو۔ اسے وہ کاغذات نہ صرف دیکھنے بلکہ لے جانے کا موقع بھی مل گیا' مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے جس خاص کاغذ کی تلاش ہے' وہ اس پلندے میں نہیں ملا' تب اس نے آپ کو گھر سے باہر نکالنے کے لیے ہمپسٹڈ کا پتہ لکھ کر بلایا۔ عین ممکن ہے کہ آپ کی غیر حاضری میں کسی شخص نے آپ کے کمرے کی تلاشی لی ہو۔"

"آہ........ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔" مس کلیگ نے ایک دم کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ہفتے کے روز شام کو جب میں دفتر سے گھر واپس پہنچی تو میرے کمرے کی بہت سی چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ الماری بھی کھولی گئی تھی اور درازیں بھی باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے شک ہوا کہ شاید یہ مالکہ مکان کی شرارت ہے۔

مگر اب........"

"مس کلیگ' میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے خلاف کوئی بھیانک سازش کی جا رہی ہے۔ مجرم کو شک ہے کہ آپ کوئی قیمتی دستاویز یا کاغذ چھپائے ہوئے ہیں اور اسے اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ شاید اسی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ہیمپسٹڈ کے مکان پر بلایا اور بدمعاشوں کے ذریعے آپ کو اغوا کرنا چاہا۔ اس کا خیال ہو گا کہ اگر وہ کاغذ آپ کے پرس میں ہوا تو چھین لیا جائے گا ورنہ اس وقت تک وہ آپ کو حبس بے جا میں رکھے گا جب تک آپ اس کاغذ کا سراغ اسے نہیں دے دیتیں۔"

"مگر سوال تو یہ ہے کہ آخر وہ قیمتی دستاویز ہے کہاں؟ اور اس کی اہمیت کیا ہے؟" لڑکی نے کہا۔

"یہی بات تو ہمیں معلوم کرنی ہے۔ آپ بالکل مت گھبرائیے میں آپ کے ساتھ ہوں۔" ولبراہام نے جوش سے کہا۔ "اب دماغ پر زور ڈال کر مجھے بتائیے کہ کیا کبھی آپ کی والدہ نے اس دستاویز یا وصیت نامے کا ذکر کیا تھا؟"

"جی نہیں۔ انہوں نے میرے سامنے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کی۔"

میجر ولبراہام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور غور کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اب مس کلیگ نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی۔ ولبراہام نے مدھم لہجے میں کہا۔

"آپ نے ابھی بتایا تھا کہ آپ کے والد کسی بحری جہاز کے کپتان تھے۔۔۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنے کسی سفر کے دوران میں انہیں کوئی ایسا کاغذ مل گیا ہو جو کسی خزانے سے متعلق ہو؟"

لڑکی نے حیرت سے ولبراہام کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے فرط جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اُف خدایا......... یہ عین ممکن ہے......... میں نے اکثر سنا ہے کہ لوگوں کو

کسی ویران جزیرے میں دبے ہوئے خزانے کا سراغ ملا ہے اور وہ بھی کسی پرانے نقشے کی مدد سے۔ میرے والد کی زندگی سمندر میں گزری تھی اور میری ماں بتایا کرتی تھی کہ انہوں نے ایسے ایسے جزیرے دیکھے تھے جہاں کسی زمانے میں بحری قزاقوں کی حکومت تھی.........."

"ذرا آہستہ بولئے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" ولبراہام نے کہا۔ "اچھا یہ بتائیے کہ آپ اس معاملے کو پولیس کے سپرد کریں گی؟"

"بالکل نہیں۔" لڑکی نے زور دے کر کہا۔ "پولیس اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی اور ویسے بھی مزید پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔"

"مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔" ولبراہام نے خوش ہو کر کہا۔ "پولیس والے اس معاملے میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ کام بنانے کی بجائے بگاڑنا زیادہ جانتے ہیں۔ بہرحال آج دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیے۔ پھر میں آپ کے ساتھ آپ کے مکان پر چلوں گا اور ہم دونوں مل کر اس قیمتی نقشے یا دستاویز کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یقین ہے یہ کاغذ ضرور آپ کے والد کے سامان میں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔"

"مگر.......... یہ بھی تو ممکن ہے کہ والد نے اسے خود ہی ضائع کر دیا ہو۔" لڑکی نے کہا۔

"ہاں ایسا ممکن ہے ' لیکن اس نام نہاد وکیل مسٹر ریڈ کے پراسرار رویے کو سامنے رکھیں تو امید بندھتی ہے کہ یہ کاغذ ضائع نہیں ہوا۔"

میجر ولبراہام نے ایک شاندار ہوٹل میں مس فریڈا کو دوپہر کا کھانا کھلایا اور اس دوران میں تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات سناتا رہا۔ مشرقی افریقہ میں گزارے ہوئے دنوں کے تذکرے سے مس فریڈا کلیگ بے حد خوش ہوئی اور ولبراہام کو انتہائی قدر اور حیرت کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ہوٹل سے نکل کر انہوں نے ایک ٹیکسی لی اور لونگ ہل گیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ مس فریڈا اسی علاقے کے ایک چھوٹے

سے مکان میں رہتی تھی۔ اس نے مالکہ مکان سے چند باتیں کیں اور پھر ولبراہام کو
دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے میں لے گئی۔ ولبراہام نے کرسی پر اطمینان سے بیٹھ
کر کہا:

"آپ کی ضروریات کے لیے یہ کمرہ بالکل مناسب ہے۔"

"جی ہاں۔" اور کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ اب ایک دلچسپ بات سنئے۔ابھی
ابھی مالکہ مکان نے مجھے بتایا کہ ہفتے کے روز جب میں صبح دفتر گئی تو کچھ دیر بعد ایک
آدمی آیا اور اس نے مالکہ مکان سے کہا کہ مس فریڈا کلیگ کے کمرے میں بجلی کے
نئے تار لگانے ہیں اور وائرنگ میں جو نقائص ہیں وہ بھی درست کرنے ہیں۔ چنانچہ
مالکہ مکان نے اسے میرے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی.. ...... اور یہی وہ
آدمی تھا جس نے دل کھول کر میرے کمرے میں الٹ پلٹ کی تھی۔"

"میں اس بدمعاش کا بھی بعد میں پتہ لگاؤں گا۔" ولبراہام نے کہا۔ "اب مجھے
اپنے والد کا وہ صندوق دکھایئے جس میں ان کے کاغذات رکھے رہتے تھے۔"

مس فریڈا نے پلنگ کے نیچے سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا بوسیدہ صندوق گھسیٹا۔
اس کے چاروں طرف لوہے کی چوڑی چوڑی پٹیاں لگی تھیں۔ ولبراہام نے اسے تجسس
کی نظروں سے دیکھا اور ڈھکنا اٹھایا۔

"یہ تو بالکل خالی ہے۔ غالباً" آپ نے سب کاغذات اس وکیل کو دے دیے
تھے۔"

"جی ہاں۔ والدہ اس صندوق کو بڑی حفاظت سے رکھتی تھیں اور کسی کو ہاتھ
لگانے کی اجازت نہ تھی۔"

ولبراہام نے انتہائی مایوسی کے عالم میں صندوق کو دیکھا۔ پھر اس کے اندر ہاتھ
ڈالا اور انگلیوں سے تختے ٹھوکنے لگا۔ دفعتہً اس کے حلق سے مسرت کی ہلکی چیخ برآمد
ہوئی۔ صندوق کا ایک اندرونی تختہ اس ٹھوک پیٹ میں ذرا سا سرک گیا اور ایک گہرا
سراخ نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے ولبراہام نے اس سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک

مڑا تڑا کاغذ باہر نکال لیا۔ پھر اس نے بے تابی سے اس کی تہیں کھولیں اور سامنے پھیلا دیا۔ فریڈا نے جھک کر کاغذ کو دیکھا اور کہنے لگی:

"اس پر یہ عجیب و غریب نشان کیسے ہیں؟"

میجر ولبرہام نے خوشی سے ہکلاتے ہوئے جواب دیا:

"خدا کی پناہ......... یہ تو سواحلی زبان لکھی ہوئی ہے۔ مشرقی افریقہ کے لوگ یہی زبان بولتے ہیں۔"

"کیا آپ اسے پڑھ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں......... میں وہاں برسوں رہا ہوں......... ذرا توجہ دوں تو ضرور پڑھ لوں گا۔"

وہ کاغذ کو احتیاط سے اٹھا کر کھلی کھڑکی کے قریب روشنی میں لے گیا۔ چند منٹ تک بغور اس کا معائنہ کرنے کے بعد وہ پلٹ کر آیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"یہ واقعی کسی خزانے کا نقشہ ہے' مگر میرا خیال ہے کہ یہ دفینہ سونے اور جواہرات کی بجائے ہاتھی دانت کا ہو گا"۔

"ہاتھی دانت؟" لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں' ہاتھی دانت کا بہت بڑا اور نہایت قیمتی دفینہ۔ ہزاروں پونڈ' بلکہ کئی لاکھ......... مشرقی افریقہ کے جنگلوں میں مقررہ تعداد سے زیادہ ہاتھی مارنے پر سخت پابندی ہے' مگر پھر بھی کئی شکاری اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہاتھی دانت حاصل کریں۔ وہ بے تحاشا ہاتھیوں کو مارتے ہیں اور منوں ٹنوں کے حساب سے ہاتھی دانت جمع کر کے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہاں سے نکال کر دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ اس کاغذ پر اسی قسم کے ایک دفینے کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اب ہمیں لازماً مشرقی افریقہ جانا پڑے گا........."

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ نقشہ میرے والد کے پاس کیسے آیا؟"

"میرا اندازہ یہ ہے کہ مشرقی افریقہ کا کوئی شکاری تمہارے والد کا دوست ہوا اور اسی نے کسی وجہ سے یہ نقشہ تمہارے والد کے سپرد کیا اور انہوں نے اس کی اہمیت جانتے ہوئے اسے اپنے صندوق کے خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ ممکن ہے انہوں نے اس دفینے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہو' مگر حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا' کیونکہ خود تمہارا بیان ہے کہ والد نے مرتے وقت کوئی روپیہ یا جائداد نہیں چھوڑی۔ اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہاتھی دانت کا خزانہ ابھی تک محفوظ ہے۔"

یہ سن کر مس فریڈا کا چہرہ خوشی کے مارے لال ہو گیا۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اوہ خدایا! کیا میں کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہوں......... ایسی کہانیاں تو بچپن میں پڑھا کرتی تھی۔"

میجر ولبراہام اس کی یہ حالت دیکھ کر مسکرایا:

"کیسا عجیب اتفاق ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔

"بہرحال یہ کاغذ نہایت قیمتی اور اہم ہے اور ان بدمعاشوں کو اسی کی تلاش ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتی ہیں تو میں درخواست کروں گا کہ یہ کاغذ مجھے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیجئے۔"

"بے شک بے شک اسے آپ اپنے پاس رکھیے۔ میں آپ پر کلی اعتماد کرتی ہوں۔ مگر دیکھیے میری وجہ سے کوئی خطرہ مول نہ لیجئے۔ وہ نہایت خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو آپ کو نقصان پہنچ جائے۔"

"مر گئے مجھے نقصان پہنچانے والے۔" ولبراہام نے مسکرا کر کہا۔" میں نے اپنی زندگی میں ایسے ایسے حادثے دیکھے ہیں کہ بیان سے باہر۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اچھا نہیں لگتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ میں کچھوے کی طرح سخت جان ہوں۔"

اس جملے پر لڑکی زور سے ہنسی۔ ولبراہام نے کاغذ موڑ کر اپنی جیب میں رکھا اور

کہنے لگا:

"میں اب گھر جا کر اس نقشے پر غور کر کے کوئی منصوبہ بناؤں گا۔ میرے پاس مشرقی افریقہ کا ایک بڑا نقشہ بھی ہے۔ اس کاغذ میں جن مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے، نقشے پر انہیں بھی تلاش کروں گا۔ کیا کل شام کو آپ سے ملاقات ہو سکے گی؟ آپ کس وقت تک دفتر سے فارغ ہو کر یہاں آ جاتی ہیں؟"

"شام ساڑھے چھ بجے تک۔"

"بہت خوب۔ میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے آ جاؤں گا اور پھر ہم کسی عمدہ ہوٹل میں ڈنر کھائیں گے۔"

فریڈا کلیگ اسے دروازے تک رخصت کرنے آئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز شام ساڑھے چھ بجے میجر ولبراہام مس کلیگ کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ ایک پختہ عمر کی خادمہ نے دروازہ کھولا۔

"مس فریڈا کلیگ گھر میں موجود ہیں؟"

"جی نہیں، وہ باہر گئی ہوئی ہیں۔"

ولبراہام کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے کلائی موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر خادمہ سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ آؤں گا اگر مس کلیگ اس دوران آ جائیں تو ان سے کہئے کہ وہ یہیں رہیں۔"

پھر وہ گلی میں ٹہلتا رہا۔ ہر آہٹ پر اس کی نگاہیں اٹھتیں اور وہ سمجھتا کہ فریڈا آ گئی لیکن وہ کوئی اور ہوتا۔ پونے سات بجے......... پھر سات......... اس کے بعد سوا سات......... فریڈا کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ اب میجر ولبراہام کے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم لینے لگے۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اسی خادمہ نے دروازہ کھولا۔ ولبراہام کی صورت دیکھتے ہی وہ بولی:

"مجھے افسوس ہے کہ مس کلیگ ابھی تک نہیں آئیں۔"

"تعجب ہے، انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج ساڑھے چھ بجے یہاں ملیں گی.........اب سات بج کر بیس منٹ ہو رہے ہیں......... ذرا معلوم کیجئے وہ کوئی پیغام تو نہیں دے گئیں؟"

"آپ کا نام میجر ولبراہام تو نہیں؟" خادمہ نے پوچھا۔

"یہی میرا نام ہے۔"

خادمہ نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا پرزہ نکالا اور ولبراہام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چھ بجے کے قریب ایک شخص آیا تھا۔ اس نے یہ رقعہ دیا اور کہا کہ میجر ولبراہام کو دے دیا جائے۔"

میجر نے دھڑکتے دل سے رقعے پر نگاہ ڈالی۔ یہ مس فریڈا کلیگ کی طرف سے تھا:

"میجر صاحب! ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جا سکتی' جتنی جلد ممکن ہو آپ وائٹ فریئرلین پہنچ جائیں۔ وہ مکان آپ بھولے نہ ہوں گے۔"

ولبراہام کے چہرے پر گہرے غوروفکر کی علامات پھیل گئیں۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے پر کسی ٹیلرنگ ہاؤس کا پتہ لکھا اور خادمہ سے کہا۔

"میں یہ لفافہ آج پوسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ ٹکٹ مہیا کر سکیں گی؟ میں پیسے ادا کر دو گا۔"

"دیکھئے میں مسزپارکنز سے کہتی ہوں۔ شاید ان کے پاس ٹکٹ ہو۔" وہ اندر گئی اور چند لمحے بعد ٹکٹ لا کر ولبراہام کے حوالے کیا۔ اس نے ایک شلنگ خادمہ کو دیا اور شکریہ ادا کر کے چل دیا۔ راستے میں اس نے لفافہ لیٹر بکس میں ڈالا' ایک جنرل مرچنٹ کی دکان سے طاقتور برقی ٹارچ خریدی اور زمین دوز ریل میں بیٹھ کر ہمپسٹڈ کی

جانب روانہ ہوا۔ بار بار وہ سوچتا کہ نہ معلوم کیا حادثہ پیش آیا کہ بے چاری فریڈا کو تن تنہا اسی مکان میں جانا پڑا جہاں سے غنڈوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ضرور اس بدمعاش وکیل مسٹر ریڈ کی شرارت ہے۔ خدا خیر کرے اگر اس نے فریڈا کو نقصان پہنچایا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے وہ رقعہ نکال کر غور سے پڑھا۔ یقیناً" کوئی خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ایسا پراسرار رقعہ فریڈا ہرگز نہیں لکھ سکتی۔

ٹھیک آٹھ بجے وہ فریزرلین میں پہنچ گیا۔ وہاں سناٹا تھا اور تاریکی۔ گہری دھند کے باعث گلیوں میں جلتے ہوئے برقی قمقمے مدھم پڑ گئے تھے۔ ولبراہام نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا وائٹ فریزرز کی طرف بڑھا۔ مکان گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہوا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکان میں کوئی نہیں۔ ولبراہام نے گھوم پھر کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ یکایک ایک کھڑکی کے نیچے سے روشنی کی کرنیں نکلتی دکھائی دیں۔ آہ.......... مکان خالی نہیں.......... ضرور کوئی موجود ہے.......... دوسرے ہی لمحے وہ روشنی غائب ہو گئی۔ اب ولبراہام نے ایک ایک کھڑکی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ شاید کوئی کھڑکی کھلی مل جائے۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کھلی نظر آئی۔

چند لمحے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے پایا۔ غالباً" یہ باورچی خانہ تھا۔ جب اس نے ٹارچ روشن کی تو بہت سے ٹوٹے پھوٹے برتن، گندے ایپرن، اور گیس کا ایک ناکارہ چولہا دکھائی دیا۔ ولبراہام نے دوسرا دروازہ کھولا تو اوپر کی منزل کو جانے والی سیڑھیاں نظر آئیں۔ ان سیڑھیوں کے ساتھ بائیں ہاتھ ایک اور دروازہ تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیے اور کچھ سننے کی کوشش کی، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ تب وہ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ یہ ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ گوشوں اور کونوں میں مکڑیوں نے جالے

تن رکھے تھے اور فضا میں عجب ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مکان برسوں سے خالی پڑا ہے۔ دہشت کی ایک نئی لہر ولبراہام کو اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ابھی وہ ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر پھینک ہی رہا تھا کہ کوئی ٹھوس چیز زور سے اس کے سر پر لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے شرارے سے اُڑنے لگے' پھر وہ کوئی آواز نکالے بغیر دھم سے زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ کتنی دیر وہ اس عالم میں پڑا رہا' اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک کوٹھڑی میں پڑے پایا۔ چھت پر بہت کم قوت کا بلب روشن تھا۔ ولبراہام کو اپنے سر میں سخت ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ چند لمحوں تک اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا......... رفتہ رفتہ اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ اسے یاد آیا کہ سر پر شدید ضرب لگنے کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا۔

دفعتہ" اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اسی کوٹھڑی میں چند فٹ کے فاصلے پر فریڈا کلیگ بھی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر پتلی رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ میجر ولبراہام نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ خود اس کے ہاتھ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ حسرت اور بے کسی سے فریڈا کو دیکھتا رہا۔ یکایک لڑکی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور جونہی اس نے میجر ولبراہام کو دیکھا' وہ چلا اٹھی:

"ارے میجر' آپ بھی یہاں آ گئے........."

"میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا اور بدمعاشوں کے پھندے میں پھنس گیا۔" ولبراہام نے جواب دیا۔ "تمہی نے تو میرے نام پرچہ بھیجا تھا اور اس جگہ آنے کو کہا تھا۔"

"میں نے؟" لڑکی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں نے تو کوئی پرچہ آپ کو نہیں بھیجا تھا۔ البتہ تمہارا ایک رقعہ مجھے ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں ساڑھے چھ بجے نہیں آسکوں گا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے شام کو ہیمپسٹڈ والے مکان میں ملو۔ بہت ضروری

ہے۔ چنانچہ میں یہاں چلی آئی اور اب آپ میرا حال دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"خدا کی پناہ ' ہمیں کیسا بے وقوف بنایا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ان بدمعاشوں کا کوئی آدمی ہماری نگرانی کر رہا تھا۔"

"ضرور یہی بات ہے۔" فریڈا نے کہا۔ "مگر سوال تو یہ ہے کہ آخر ہمیں یوں باندھنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ نقشہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اندازہ کرلیا ہو گا کہ نقشہ میرے پاس ہے' اسی لیے وہ میرے پیچھے لگ گئے۔"

اچانک کوٹھڑی میں ایک بھاری مردانہ آواز گونجی:

"میجر ولبراہام اور مس فریڈا کلیگ کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں......... جی ہاں' وہ قیمتی نقشہ میں نے حاصل کرلیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہے کا امکان نہیں۔"

"مسٹر ریڈ........." فریڈا نے مدھم آواز میں ولبراہام سے کہا۔ "یہ اسی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔" جواب میں ایک گرجدار قہقہہ سنائی دیا۔

ہاں ' میرا ایک نام ریڈ بھی ہے اور نہ جانے میرے کتنے نام ہیں۔ بہرحال اب مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ دونوں نے میرے کام میں مداخلت کی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ یہ مکان میرے لیے نہایت عمدہ پناہ گاہ ہے۔ آپ لوگوں کو اس کا بھی علم ہو گیا ہے۔ اگرچہ آپ نے ابھی تک پولیس کو اس بارے میں آگاہ نہیں کیا۔ تاہم کسی بھی وقت اس بات کا امکان ہے کہ آپ پولیس کو مطلع کر دیں......... اس لیے ضروری ہے کہ میں آپ کا منہ بند کروں......... ممکن ہے آپ مجھ سے منہ بند رکھنے کا وعدہ کریں' مگر میں آپ کے وعدے پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے افسوس سے یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو دوسری دنیا کی طرف روانہ کر دوں۔"

یہ بھیانک آواز چند ثانیوں کے لیے رکی اور پھر شروع ہو گئی۔

"میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا......... اس لیے آپ اطمینان رکھیے.........

میں آپ کو نہایت پر سکون انداز میں موت کے حوالے کروں گا.......... آپ کو قطعاً کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اچھا' اب مجھے اجازت دیجئے۔ خدا آپ پر رحم کرے۔"

جونہی آواز تھمی۔ میجر ولبراہام حلق پھاڑ کر چلایا۔

"دیکھو مسٹر ریڈ' تمہارا رویہ سخت ظالمانہ ہے۔ میرے ساتھ تم جو چاہو سلوک کرو' مگر اس معصوم لڑکی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے' کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

وہ چلاتا رہا' مگر ریڈ کی آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔ معاً" فریڈا پوری قوت سے چیخ اٹھی "پانی.......... پانی.........." ولبراہام نے گردن موڑ کر فریڈا کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں چھت کے ایک تاریک گوشے کو گھور رہی تھیں اور پھر ولبراہام کا کلیجا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چھت کے ایک باریک سوراخ سے پانی کی مسلسل دھار کوٹھڑی میں آ رہی تھی۔

"وہ ہمیں پانی میں غرق کر کے مارنا چاہتا ہے۔" فریڈا نے چیخ کر کہا اور سسکیاں لینے لگی۔ ولبراہام کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے۔ اس نے بے بس نظروں سے فریڈا کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"اگر تم اس طرح روؤ گی تو میرے ہاتھ پاؤں بھی پھول جائیں گے۔ خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے دو۔"

اس کے ان الفاظ کا لڑکی پر گہرا اثر ہوا۔ وہ یک لخت چپ ہو گئی۔ ولبراہام نے کہا:

"اگر ہم دونوں مل کر پوری قوت سے چیخیں تو شاید ہماری آواز اس منحوس مکان سے باہر پہنچ جائے اور عین ممکن ہے کوئی ہماری مدد کو آ سکے۔"

وہ دونوں حلق پھاڑ پھاڑ کر دیر تک چلاتے رہے' مگر بے سود۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے علاوہ دور دور تک یہاں کوئی اور انسان موجود نہیں ہے۔

"اب کیا کریں ؟" ولبراہام نے ہانپتے ہوئے کہا۔ فریڈا نے کچھ جواب نہ دیا' البتہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری تھا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی اس مصیبت میں پھنسا دیا' نہ جانے اب کیا ہو گا؟"

"فکر مت کرو۔ جب تک سانس تب تک آس۔" ولبراہام نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "کوٹھڑی میں پانی جس رفتار سے داخل ہو رہا ہے' اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ہمیں غرق ہونے میں کئی گھنٹے لگیں گے۔ اس دوران میں ہم بہت کچھ کر سکتے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں اس مصیبت سے نکال لے جاؤں گا' بشرطیکہ تم حوصلہ نہ ہارو۔"

"آہ' میجر ولبراہام' آپ کتنے اچھے آدمی ہیں۔" فریڈا نے کہا۔

چند لمحے بعد ولبراہام نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش شروع کی۔ ابتدا میں یوں محسوس ہوا جیسے ہر کوشش بے کار ثابت ہو گی' مگر ایک گھنٹے کی جان ہار محنت کے بعد وہ رسیاں ڈھیلی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک پانی ان کے ٹخنوں پر آ چکا تھا۔ ولبراہام نے اپنے آپ کو آزاد کرا لینے کے بعد جلدی سے فریڈا کی رسیاں کھولیں اور کوٹھڑی کا بوسیدہ دروازہ ایک ہی دھکے سے توڑ کر باہر نکل آیا۔ کئی زینوں اور راہداریوں میں سے گزرتے ہوئے بالآخر وہ مکان سے باہر سڑک پر پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

ٹھنڈی ہوا میں گہرے سانس لینے کے بعد وہ تازہ دم ہو گئے اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہوئے۔ وہ جلد سے جلد اس مقام سے دور ہٹ جانا چاہتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسٹر ریڈ دوبارہ کوئی حرکت کر سکتا ہے۔ راستے میں ولبراہام نے کہا۔

"اب میں وہ خزانہ بھی اپنے قبضے میں کر لوں گا خواہ مجھے اس کی خاطر اپنی تمام دولت ضائع کرنی پڑے۔"

فریڈا نے ولبراہام کا بازو سختی سے تھام کر کہا۔

"مجھے خزانے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔ تم وعدہ کرو کہ زندگی بھر میرا ساتھ دو گے۔"

ولبراہام نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔
"خزانہ تو میں حاصل کر کے چھوڑوں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ کل ہی تم سے شادی کر لوں گا۔"
"لیکن .... خزانے کا نقشہ تو اس بدمعاش نے اڑا لیا ہے۔ نقشے کے بغیر یہ کام کیسے ہو گا؟" فریڈا نے کہا۔
ولبراہام نے ایک اور قہقہہ لگایا۔
"میں نے انہیں بے وقوف بنایا۔ میں پہلے ہی خطرے کی بو پا چکا تھا' اس لیے اصل نقشہ میں نے لفافے میں بند کر کے اپنے درزی کے پتے پر روانہ کر دیا ہے اور نقلی نقشہ بنا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب وہ لاکھ سر ماریں' ہرگز ہرگز خزانہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ شادی کے فوراً بعد ہم ہنی مون منانے مشرقی افریقہ روانہ ہو جائیں گے۔"

☆ ☆ ☆

پارکرپائن مکان کی آخری منزل پر گیا اور ایک دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کسی کی آواز آئی۔ "چلے آیئے۔"
"صبح بخیر مسز اولیور......... کہئے مزاج اچھے ہیں۔"
ایک باوقار بوڑھی عورت نے کرسی سے اٹھ کر پارکرپائن کا استقبال کیا۔ کمرے میں چاروں طرف کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔
"آپ کا نیا ناول کیا ختم ہو گیا؟" پارکرپائن نے پوچھا۔ "آپ کے جاسوسی ناولوں نے تو بازار میں دھوم مچا دی ہے۔" مسز اولیور کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے گفتگو کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔
"کہئے' وہ "پانی والی کوٹھڑی" کا معاملہ کیسا رہا؟"
"بالکل کامیاب......... سو فی صد کامیاب........." پارکرپائن نے ہنستے ہوئے

کہا۔

مسز اولیور نے میز کی دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر بڑھایا اور کہا۔

"براہِ کرم یہ بل جلد ادا کرا دیجئے گا۔"

پارکرپائن نے بل پر نگاہ ڈالی' اس میں کچھ اس قسم کا حساب کتاب درج تھا:

۱۔ پرسی اور جیری (دو نام نہاد بدمعاشوں کی) خدمت کا معاوضہ	پانچ پونڈ
۲۔ ایکٹر لاریمر' جس نے مسٹر ریڈ و وکیل کا کردار ادا کیا	دس پونڈ
۳۔ کوٹھڑی میں پانی گرانے والے لڑکے جانی کا معاوضہ	ایک پونڈ
۴۔ مس فریڈا کے گھر کی بجلی ٹھیک کرنے والا	ایک پونڈ
کل میزان :	سترہ پونڈ

"فریئرلین والا مکان میرے لیے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔" پارکرپائن نے بل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب تک وہاں آٹھ ایسے ہی ڈرامے ہو چکے ہیں۔"

""مسٹر ریڈ کی آواز کا ریکارڈ بھر لیا گیا تھا' چنانچہ وہ میجر ولبرہام اور مس فریڈا کو سنوا دیا گیا۔" مسز اولیور نے کہا۔

"خوب خوب......... مگر یہ تو بتایئے کیا آپ سواحلی زبان بھی جانتی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

پھر آپ نے اس بوسیدہ کاغذ پر خزانے کا نقشہ سواحلی زبان میں کیسے تیار کر لیا۔"

"لندن میوزیم کے شعبۂ اطلاعات نے میری مدد کی۔" مسز اولیور نے جواب دیا۔ "مگر مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ جب یہ جوڑا مشرقی افریقہ پہنچے گا تو وہاں انہیں کوئی خزانہ نہ مل سکے گا۔"

☆ ☆ ☆

مشرقی افریقہ کے کسی شہر کے ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں ایک خوش

و خرم جوڑا رہائش پذیر ہے۔ میجر ولبراہام اور مسز ولبراہام۔ میجر نے ایک خط لکھتے لکھتے اچانک سر اٹھایا اور اپنی بیوی سے پوچھا:

"فریڈا' آج کیا تاریخ ہے؟"

"سولہ"

"خدا کی پناہ........ میں تو بالکل بھول گیا تھا۔"

"آخر بات کیا ہے؟" فریڈا نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ........ کچھ نہیں........ ابھی ابھی ایک شخص کا نام یاد آیا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری ملنا تھا۔ غالباً" اس کا نام مسٹر جونز بتایا گیا تھا۔" پھر وہ دل میں سوچنے لگا۔

اس مکار شخص پارکرپائن نے خوامخواہ مجھ سے پچاس پونڈ اینٹھ لیے۔ وہ تو اتفاق سے فریڈا میرے راستے میں آ گئی۔ بھلا پارکرپائن نے میرے لیے کیا کیا۔ میں اس سے اپنی رقم واپس نہ لے لوں؟ لیکن اس میں بہرحال غلطی میری ہی ہے۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور مسٹر جونز سے فریئرلین میں ملاقات نہ کی۔ خیر چھوڑو۔ پچاس پونڈ ہی کی تو بات ہے اب کیا واپس لوں۔"

اور ادھر اس کی بیوی فریڈا دل میں کہہ رہی تھی۔

وہ شخص........ کیا نام تھا اس کا........ ہاں' یاد آیا۔ پارکرپائن۔ نرا فراڈ ہے۔ اس نے مجھے کیسا بے وقوف بنایا۔ کہتا تھا آپ کی زندگی میں خوشیاں بھر دوں گا۔ خوشیاں تو بے شک آ گئیں........ مگر اس نے پچاس پونڈ کی فیس کس حساب میں وصول کی۔ اتفاق سے میری ملاقات ولبراہام سے ہو گئی ورنہ زندگی یوں ہی بیت جاتی۔ اس نے پیار سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور مدھم آواز میں ایک گیت گنگنانے لگی۔

*

کیا وُہ اپنی بیوی کا قاتل تھا؟

27 سالہ امریکی سارجنٹ مارکس میرے مونٹ پر اپنی بیوی کو سنکھیا سے ہلاک کرنے کے الزام میں امریکہ کی جنرل کورٹ مارشل میں ڈین ہام (بکس) کے مقام پر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ واقعہ دسمبر 1958 میں پیش آیا تھا۔ سارجنٹ نے اپنی بیوی کو برطانوی علاقے میں ہلاک کیا تھا لیکن اس پر مقدمہ امریکی حدود میں چلایا گیا۔ سارجنٹ مونٹ پر استغاثہ کی جانب سے دو الزامات عائد کئے گئے۔ پہلا یہ کہ اس نے اپنی 43 سالہ بیوی کو سنکھیا سے ہلاک کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے ایک شادی شدہ عورت مسز سانتھیا ٹیلر سے ناجائز طور پر جنسی تعلقات استوار کیے اور 20 دسمبر 1956ء سے 31 مئی 1958ء کے درمیانی عرصے میں اس سے نفسانی خواہشات پوری کرتا رہا اور پھر اسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر اس نے 9 جون 1958ء کو اپنی بیوی میری ہیلن میرے مونٹ کو سنکھیا دیا' جس کے زیر اثر وہ نارفوک کے فوجی فضائی ہسپتال میں انتقال کر گئی۔ بیوی کی موت کے پانچ ہفتے بعد اس کے خاوند کو پولیس نے قتل کے شبہے میں گرفتار کر لیا' چونکہ لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ اسے سنکھیا دیا گیا تھا۔ مقدمے کے دوران سارجنٹ مونٹ نے استغاثہ کی جانب سے عائد

کردہ دونوں الزامات کی صحت سے انکار اور اپنے آپ کو بے قصور ظاہر کیا۔

مارشل کورٹ کا صدر کرنل البرٹ سنائیڈر تھا۔ استغاثہ کی جانب سے میجر لوئیس اور صفائی کی طرف سے میجر نیل کاسڈن نے مقدمے کی پیروی کی۔ میجر لوئیس نے استغاثہ کی جانب سے بیان دیتے ہوئے ان واقعات کی نشان دہی کی جن کے باعث ہیلن میرے مونٹ ہلاک ہوئی تھی۔ میجر نے کہا کہ 9 ر جون کو دوپہر کے دو بجے مسز میرے مونٹ کو نہایت ابتر حالت میں ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ہسپتال کے تین ڈاکٹروں نے مریضہ پر ہنگامی نوعیت کا علاج کیا لیکن ان کی ساری کوششیں بے سود رہیں اور مریضہ اسی روز رات کو 9 بجکر 47 منٹ پر ختم ہو گئی۔ سارجنٹ میرے مونٹ نے پہلے اس بات پر اپنی رضا مندی ظاہر کی کہ لاش کا پوسٹ مارٹم ہونا چاہیے لیکن بعد ازاں یہ ارادہ بدل دیا۔ میجر لوئیس نے کہا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی لیبارٹری کے ڈائریکٹر مسٹر نکولس نے پوسٹ مارٹم کے بعد یہ شہادت دی تھی کہ مقتولہ کے معدے اور خون کی رگوں میں سنکھیا کے اثرات واضح طور پر پائے گئے ہیں اور تجزیے کے بعد پتہ چلا ہے کہ مقتولہ کو موت سے آٹھ ہفتے پہلے بھی سنکھیا کی بڑی مقدار مختلف ذرائع سے استعمال کرائی گئی ہے۔

میجر لوئیس نے واردات کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ملزم کو ایک دوسری عورت سے عشق ہو گیا تھا۔ جس کا نام مسز سائنتھیا ٹیلر ہے اور ہمارے پاس واضح شہادت موجود ہے کہ یہ "عشق بازی" معمولی نہ تھی بلکہ اس کا سلسلہ دو سال پہلے سے چل رہا تھا۔ اور ملزم اس عورت کے عشق میں اس بری طرح مبتلا تھا کہ وہ ہر ہفتے کی رخصت پر اس عورت کے پاس جایا کرتا تھا' حتیٰ کہ کرسمس 1957ء کی تمام چھٹیاں بھی ملزم نے اپنی محبوبہ کے ساتھ بسر کیں اور بیوی بچوں کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ وکیل استغاثہ نے بتایا کہ آخر مسز سائنتھیا کی محبت میں مجبور ہو کر ملزم نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ وہ خود اپنے خاوند سے بیزار تھی اور اسے طلاق دینے کی فکر میں تھی۔

میڈین ہیڈ میں جہاں سارجنٹ کی محبوبہ رہا کرتی تھی' وہیں ایک کیمسٹ کی دکان سے سارجنٹ نے 24 مئی 1958ء کو سنکھیا خریدنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ اس کے پاس زہر حاصل کرنے کی کوئی سند موجود نہ تھی اس لیے دکان دار نے اسے سنکھیا دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن سارجنٹ نے ہسپتال کی لیبارٹری سے سنکھیا کی کافی مقدار چوری کر لی۔ وکیل استغاثہ کا بیان ختم ہونے کے بعد عدالت میں آنے والا پہلا گواہ کیپٹن میکس تھا جو نارفوک کے سکل تھورپ ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی شہادت میں کہا کہ مسز میرے مونٹ کو جان کنی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا اور ایک نظر دیکھتے ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ مریضہ کو زہر دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے مریضہ کے شوہر سارجنٹ میرے مونٹ سے کہہ دیا کہ مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہے اور ممکن ہے کہ وہ زندہ نہ بچ سکے۔ اس پر بھی وہ نہ گھبرایا اور نہ پریشانی ظاہر کی بلکہ میں نے محسوس کیا کہ اسے ایک طرح کا اطمینان ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں نے سارجنٹ سے جب اس کی بیوی کی گرتی ہوئی حالت کے متعلق گفتگو کرنی چاہی تو اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔ باتوں باتوں میں سارجنٹ نے بتایا کہ "میری بیوی کی گزشتہ رات 9 بجے کے قریب اچانک طبیعت بگڑ گئی چنانچہ میں ہسپتال گیا اور جو ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھا' اس سے دوا لے کر آیا۔ لیکن دوا سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوا اور وہ ساری رات تکلیف میں رہی۔" کیپٹن پچ فیوار نے عدالت سے کہا کہ سارجنٹ نے مجھے بتایا کہ میری بیوی اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بیمار ہو چکی ہے لیکن جو حالت اس مرتبہ ہے وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آج سے چھ ہفتہ قبل بھی وہ اسی طرح اچانک بیمار ہو گئی تھی۔

سکل تھورپ ہسپتال کے ایک ڈاکٹر البرٹ کوک نے بھی عدالت میں شہادت دی کیونکہ ڈاکٹر البرٹ بھی اس روز ہسپتال میں موجود تھا جس روز مسز مونٹ کا انتقال ہوا تھا۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر البرٹ نے کیپٹن فیوار سے کہا تھا کہ اس عورت کو زہر دیا گیا ہے عدالت میں ڈاکٹر البرٹ نے انکشاف کیا کہ جس رات مسز مونٹ نے

وفات پائی' اسی رات بارہ ایک بجے کے قریب متوفیہ کا شوہر میرے پاس آیا اور کہا کہ میرے بچے نہیں چاہتے کہ لاش کو چیرا پھاڑا جائے۔ اس لیے پوسٹ مارٹم کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ میں ایک سال قبل بھی متوفیہ کا علاج کر چکا تھا' کیونکہ اسے اکثر قے آتی تھی۔ عدالت کے دریافت کرنے پر ڈاکٹر نے کہا کہ مجھے اس وقت بھی شبہ تھا کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر البرٹ کے بعد ہسپتال کی ایک سٹاف نرس کیپٹن جینٹ ہائیڈ نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ مسز مونٹ کا جب انتقال ہوا تو اس کا شوہر دس منٹ تک سسکیاں لے لے کر روتا رہا۔ نرس نے کہا کہ مرنے سے پہلے متوفیہ نے مجھے بتایا تھا کہ گزشتہ سال بھی اس کی طبیعت اسی طرح بگڑ گئی تھی اور اس کا خاوند اسے "دوا" لا کر دیتا رہا کہ اس کے استعمال سے اسے آرام آ جائے گا۔

وکیل استغاثہ نے عدالت کو بتایا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ متوفیہ کے معدے میں سنکھیا کی دو سے تین گرین تک مقدار موجود تھی۔ اور گزشتہ سال کے دوران کئی مرتبہ کھانے اور دوسرے مشروبات میں اسے سنکھیا دی جاتی رہی ہے۔کیونکہ یہ زہر پھیکا ہوتا ہے' اس لیے اسے آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا اور کھانے پینے کی چیزوں میں بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں ہوم آفس پاتھا لوجسٹ ڈاکٹر فرانسس کیمپس نے بھی اپنی شہادت میں یہی باتیں کہیں اور متوفیہ کے اندرونی جسم میں سنکھیا کا موجود ہونا ثابت کیا اور کہا کہ سنکھیا جسم کے اندر پہنچانے کے کئی طریقے ہیں' جن میں سے دو طریقے عام ہیں۔ ایک انجکشن کے ذریعے اور دوسرا منہ کے ذریعے......... اس کیس میں متوفیہ کے اندرونی جسم کے تجزیے سے معلوم ہوا کہ وہ منہ کے ذریعے سنکھیا استعمال کرتی رہی ہے۔

ڈاکٹروں کے بعد اس کیس کی ایک اہم شخصیت مسز سالتھیا ٹیلر کا بیان تھا کہ اس عورت کی عمر 23 سال تھی۔ سب سے پہلے عدالت میں وہ خطوط پڑھ کر سنائے گئے جو سارجنٹ میرے مونٹ نے اپنی محبوبہ کو لکھے تھے۔ بعد ازاں مسز ٹیلر نے بتایا کہ سارجنٹ سے اس کے تعلقات دو برس سے زائد عرصے سے قائم ہیں ان کی پہلی

ملاقات جولائی 1956ء میں ہوئی تھی اور پھر ہر مہینے میں ایک یا دو مرتبہ وہ آپس میں ضرور ملتے تھے۔ مسز ٹیلر سے پوچھا گیا کہ "کیا تمہارے علم میں یہ بات تھی کہ سارجنٹ مونٹ شادی شدہ ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "جی نہیں یہ میرا خیال تھا کہ اس کی بیوی اسے طلاق دے چکی ہے۔"مسز ٹیلر نے بتایا کہ 1957ء میں ہمارے درمیان اس بات پر سنجیدگی سے گفتگو ہوئی تھی کہ ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ لیکن چونکہ مجھے اپنے خاوند سے ابھی طلاق لینی تھی اس لیے سارجنٹ نے مجھے شادی کی انگوٹھی نہیں دی۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ گزشتہ مئی میں اپنی سالگرہ کے موقع پر اس نے مجھے نیلم کی ایک انگوٹھی تحفے کے طور پر دی تھی۔ مسز ٹیلر نے بتایا' اسے معلوم تھا کہ سارجنٹ کے تین بچے بھی ہیں۔ بہرحال سارجنٹ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ میں اسی سال دسمبر میں اپنے خاوند سے طلاق حاصل کر سکوں گی۔

سارجنٹ مونٹ کو میں نے آخری مرتبہ 14 ,جون کو دیکھا تھا۔ اس روز وہ دوپہر دو بجے کے قریب میرے گھر آیا تھا اور پھر 25 ,مئی اتوار تک ٹھہرا رہا۔ اس نے مجھے جوتوں کا ایک جوڑا خرید کر دیا اور پھر "کلیرج" میں ڈنر کھلانے کے لیے لے گیا تھا۔ 14 ,جون کو اس نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی اچانک مر گئی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا امریکہ میں؟" اس نے جواب دیا۔ "نہیں' یہاں انگلینڈ میں۔ وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئی تھی۔" میں نے اس سے کہا لیکن تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم طلاق لے چکے ہو؟ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ "ہاں مجھے معلوم ہے۔"

وکیل استغاثہ نے مسز ٹیلر سے پوچھا کہ سارجنٹ مونٹ کو تم اپنی سہیلیوں اور پڑوسیوں کے سامنے کیا کہہ کر متعارف کراتی تھیں؟ مسز ٹیلر نے جواب دیا۔ "میں اسے اپنے دوست اور منگیتر کی حیثیت سے پیش کیا کرتی تھی۔"

مسز ٹیلر کے بعد نائب وکیل استغاثہ کیپٹن ایلس نے سارجنٹ مونٹ کی جانب

سے ایک تحریری بیان عدالت میں پڑھ کر سنایا جو اس نے اپنی بیوی کی موت کے سات دن بعد پولیس کو دیا تھا۔ کہا گیا کہ یہ بیان لکھواتے وقت سارجنٹ زارو قطار رو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ

"ہیلن سے میری شادی 1943ء میں ہوئی تھی۔ شادی کے ابتدائی سال بہت اچھی طرح بسر ہوئے۔ لیکن 1954ء میں جاپان سے امریکہ آنے کے بعد ہمارے آپس کے تعلقات میں کافی تبدیلی رونما ہوئی۔ اب وہ پہلی سی محبت اور گرمجوشی باقی نہ رہی تھی۔ جنوری 1956ء میں مجھے برطانیہ بھیج دیا گیا اور میں بیوی بچوں سمیت انگلینڈ گیا۔ ہمیں کنگ لینن میں ایک مکان مل گیا لیکن میری بیوی کو یہ مکان پسند نہ تھا اور نہ وہ انگلینڈ میں رہنا چاہتی تھی.........

"اسی سال جنوری میں مجھے میڈن ہیڈ کے ایک کلب گھر میں جانے کا اتفاق ہوا' وہاں میری ملاقات مسز سائنتھیا ٹیلر سے ہوئی۔ چونکہ مجھے اپنے سرکاری فرائض کی بجا آوری کے لیے گاہے گاہے لندن آنا پڑتا تھا' اس لیے مسز سائنتھیا سے میرے تعلقات برابر استوار ہوتے رہے۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اپنے خاوند سے ناچاقی کی بنا پر علیحدہ رہتی تھی۔ میں نے مسز ٹیلر کو بتایا کہ میں مطلقہ ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مسز ٹیلر بھی مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ وہ اس سال اپنے خاوند کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر لے گی۔ لیکن اس عرصے میں میری بیوی کو علم ہو گیا کہ میں نے مسز ٹیلر سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں' اسے بڑا صدمہ ہوا اور میں نے بھی محسوس کیا لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں اس عورت کے بغیر زندگی میں ایک بے جان سا خلا محسوس کرتا تھا۔ بہرحال میں نے مسز ٹیلر سے میل ملاقات برابر جاری رکھی.........

"میری بیوی کو ان تعلقات کا علم کیسے ہوا' یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ گزشتہ اپریل میں میں نے مسز ٹیلر کو ایک خط لکھا تھا۔ لیکن میں یہ خط ڈاک میں ڈالنا بھول گیا اور وہ میرے کوٹ کی جیب ہی میں پڑا رہ گیا۔ ایک روز میری بیوی نے یہ خط

نکال کر پڑھا تو اسے معلوم ہوا کہ میں لندن میں ایک غیر عورت سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہوں۔ جب میں گھر واپس آیا تو میری بیوی کا چہرہ رنج سے سفید پڑا ہوا تھا اور وہ نڈھال سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اب بھی مجھ سے بدستور محبت کرتی ہے اور اب بھی میری حرکتوں کو فراموش کرنے کے لیے تیار ہے' بشرطیکہ میں مسز ٹیلر سے آئندہ نہ ملنے کا وعدہ کروں......... میں نے اسے اطمینان دلایا کہ میں آئندہ مسز ٹیلر سے نہیں ملوں گا۔ لیکن میں نے اسے جھوٹی تسلی دی تھی' میں بدستور اپنی محبوبہ سے ملتا رہا۔ اب میرے اور بیوی کے درمیان تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی اور میں اس ناگوار صورتِ حال سے تنگ آ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میری بیوی نے چوہوں کو مارنے والی گولیاں کھا کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کیا ہے۔ ایک روز میں نے الماری میں چوہے مار دوا کی شیشی نکالنی چاہی تو وہاں شیشی موجود نہ تھی۔ میری بیوی نے کہا کہ اس نے دوا باہر پھینک دی ہے۔"

سکل تھورپ ہسپتال میں صفائی کرنے والے دو ملازموں جیمز ٹوائیٹ اور چارلس ویٹرن نے گواہی دیتے ہوئے کہا۔ "ماہ مئی میں ایک روز کافی رات گئے ایک "ماسٹر سارجنٹ" ہسپتال کی نچلی منزل میں قائم شدہ کیمیکل لیبارٹری میں داخل ہوا۔ جہاں دوسری زہریلی اور کیمیاوی دواؤں کے ساتھ سنکھیا کی شیشیاں بھی الماریوں میں رکھی تھیں۔" چارلس ویٹرن سے جب پوچھا گیا کہ آیا وہ اس "ماسٹر سارجنٹ" کو شناخت کر سکتا ہے؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سارجنٹ نے لیبارٹری میں داخل ہونے کے بعد کہا۔

"ان الماریوں میں تو کیمیاوی دوائیں بھری پڑی ہیں اور یہاں تو سنکھیا بھی موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "جی ہاں......... یہ سب چیزیں یہاں ہیں ان کی ضرورت تو پڑتی ہی رہتی ہے۔" اس پر سارجنٹ نے تشویش انگیز لہجے میں کہا۔ "ان خطرناک زہروں کو مقفل رکھا جانا چاہیے........"

دوسرے ملازم جیمز ٹوائیٹ نے اپنے ساتھی کے بیان کی تصدیق کی اور جب

اسے کہا گیا کہ وہ کمرہ عدالت میں "ماسٹر سارجنٹ" کو شناخت کرے تو اس نے فوراً سارجنٹ مونٹ کو پہچان کر اشارے سے بتایا کہ "یہی صاحب لیبارٹری میں آئے تھے........" جیمز ٹوائیٹ نے عدالت کو مزید بتایا کہ "سارجنٹ کچھ دیر لیبارٹری کا جائزہ لینے کے بعد ایک الماری کی جانب گیا' جہاں ایک کونے میں چار پانچ بوتلیں رکھی تھیں اور ان پر سبز رنگ کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ اس نے دو تین بوتلوں کو باری باری اٹھا کر دیکھا اور پھر وہیں رکھ دیا۔ پھر وہ ایک دوسری الماری کی طرف گیا جہاں ایک بڑا مرتبان رکھا تھا لیکن اس نے مرتبان کو نہیں چھوا........

اس کے بعد ہائی سٹریٹ میڈین ہیڈ کے ایک دوا فروش مسٹر برنارڈ سیمپسن نے عدالت کو بتایا کہ "میری دکان پر سنکھیا موجود ہے لیکن ہم اسے عام دواؤں کی طرح فروخت نہیں کرتے۔ سنکھیا خریدنے کے لیے ضروری ہے کہ گاہک کے پاس پولیس کی جانب سے جاری کردہ اجازت نامہ موجود ہو۔ جس میں بتایا جائے کہ سنکھیا کس مقصد کے لیے اور کہاں استعمال کیا جائے گا........ اور کتنی مقدار میں اس کی ضرورت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ 23 ر یا 24 ر مئی کو بعد دوپہر سارجنٹ مونٹ میری دکان میں آیا اور مجھ سے پوچھا' کیا میں سنکھیا فروخت کرتا ہوں؟ میں نے جواب دیا........ ہاں۔ لیکن آپ کے پاس سرکاری طور پر سنکھیا خریدنے کا پرمٹ ضرور ہونا چاہیے۔ یہ سن کر سارجنٹ نے "آل رائیٹ" کہا اور دکان سے باہر نکل گیا۔ ہماری یہ گفتگو بہ مشکل چند سیکنڈ ہی ہوئی ہو گی۔"

اب سارجنٹ مونٹ کی باری آئی۔ عدالت کے دریافت کرنے پر اس نے اقرار کیا کہ اسے بے شک مسز ٹیلر سے عشق ہو گیا تھا اور ہے........ اور ان کے درمیان یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ جب مسز ٹیلر اپنے خاوند سے طلاق لے کر سارجنٹ مونٹ سے شادی کرے گی تو وہ اس کے لڑکے کی پرورش کا ذمہ لے گا۔ لیکن بعد ازاں ایک قانونی مشیر نے سارجنٹ اور مسز ٹیلر کو بتایا کہ مسز ٹیلر کے پاس اپنے خاوند کو طلاق دینے کے لیے مناسب شہادت موجود نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی عدالت اس طلاق

پر رضامند نہیں ہو سکے گی۔

عدالت کے صدر کرنل البرٹ کے سوال پر سارجنٹ نے اس امر کی تردید کی کہ وہ میڈین ہیڈ کی کسی دکان میں کبھی سنکھیا خریدنے گیا تھا اور نہ اس نے اپنے گھر میں کبھی سنکھیا لا کر رکھی تھی......... البتہ اس نے ہسپتال میں صفائی کرنے والے دونوں ملازموں کے بیان کو درست تسلیم کیا اور اقرار کیا کہ وہ واقعی لیبارٹری میں گیا تھا لیکن اس نے وہاں سے سنکھیا نہیں چرایا.........

ان تمام شہادتوں کے بعد استغاثہ اور صفائی کے وکلاء میں کامل دو گھنٹے تک بحث جاری رہی۔ مجرم کے وکیل نے اس امر پر ملازموں کے بیان کو درست تسلیم کیا اور اقرار کیا کہ وہ واقعی لیبارٹری میں گیا تھا۔ لیکن اس نے وہاں سے سنکھیا نہیں چرایا۔

وکیلِ صفائی نے اس امر پر زور دیا کہ مسز ٹیلر کے نام سارجنٹ مونٹ کے تحریر کردہ جتنے "محبت نامے" عدالت میں پیش کئے گئے ہیں' ان سے یہ قطعاً" ظاہر نہیں ہوتا وہ دونوں ایک دوسرے پر بری طرح فدا تھے۔ ان میں صرف دوستانہ تعلقات تھے۔ اور ظاہر ہے کہ محض دوستانہ تعلقات کی بنا پر سارجنٹ مونٹ اپنی بیوی کو کسی طرح بھی ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سارجنٹ مونٹ اپنی "محبوبہ" سے شادی کرنے کے لیے بیوی کو قتل کر سکتا تھا تو میں یہ کہوں گا کہ خدا ہمارے معاشرے پر رحم کرے۔ کیونکہ آج کون ہے جو شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود غیر عورتوں سے دوستانہ تعلقات استوار نہیں کیے ہوئے ہے؟ اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ چیز روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے.........

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی شخص اس "عشق بازی" کو نبھانے کے لیے اپنی بیوی کو خوامخواہ قتل کر دے......... اس کیس میں یہ قطعی ثابت نہیں ہوتا کہ سارجنٹ مونٹ کی کسی حرکت کے باعث اس کی بیوی ہلاک ہوئی۔ میں تو یہ کہتا

ہوں کہ قتل سے زیادہ خود کشی اور غلطی کی بنا پر زہر کھا لینے کے امکانات زیادہ قوی ہیں۔ اگر محض قیاس اور شک و شبہے کی بنا پر سارجنٹ مونٹ کو قانون سزا دینی چاہتا ہے تو میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا پورا نظام قانون ناقص ہے۔

یہاں سوال صرف یہ نہیں کہ سارجنٹ نے ایک غیر عورت کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنی بیوی کو ہلاک کیا بلکہ اس تباہ کن سوسائٹی کا ہے' جہاں ہر سال ہزاروں خاندانوں میں اسی "رومانس" کی بدولت ناچاقی پیدا ہوتی اور معاملے عدالتوں تک پہنچتے ہیں۔

عدالت نے کافی غور و خوض کے بعد سارجنٹ مونٹ کو مجرم قرار دیتے ہوئے عمر قید کی سزا کا حکم سنایا۔ فیصلے میں کہا گیا کہ "چونکہ مجرم نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی بیوی کو زہر سے ہلاک کیا ہے' اس لیے اسے موت کی سزا کے بجائے عمر قید کی سزا دی جاتی ہے........" یہ فیصلہ سننے کے بعد مجرم نے کہا کہ "میں نے عدالت میں جو بیان دیا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا' اور میں پھر یہ کہتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو ہلاک نہیں کیا۔ میری بیوی جب بیمار ہوئی تو میں نے اس کی دل و جان سے تیمار داری کی' جس کا صلہ مجھے یہ ملا ہے.........."

سارجنٹ مونٹ نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی لیکن یہ اپیل خارج کر کے سزا بحال رکھی گئی اور اسے لیون ورتھ (کنساس) کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ 8 مئی 1959ء کو جیل خانے میں اسے مسز ٹیلر کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "جونہی اسے اپنے خاوند سے طلاق ملی وہ مونٹ سے شادی کر لے گی۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مونٹ بے گناہ ہے۔ مجھے اس بات کی قطعاً" پروا نہیں کہ وہ کب رہا ہو گا یا نہیں ہو گا......... میں اس سے محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔"

*

کمرہ نمبر سات

ان عجیب و غریب اور انتہائی ہولناک وارداتوں کی وجہ سے پیرس میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ اخبارات انہی کے احوال سے بھرے ہوئے تھے' صبح شام ضمیمے شائع ہو رہے تھے اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ پولیس افسروں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں' ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ بہت سے مشکوک کردار کے افراد کو تفتیش میں شامل کیا جا چکا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔

ہوٹل ڈی فرانس کا کمرہ نمبر سات ان پراسرار وارداتوں کے سبب سے ایک لاینحل معمّہ بن گیا تھا۔۔۔ مختصر وقفوں سے یکے بعد دیگرے تین افراد اس کمرے میں قیام پذیر ہوئے اور تینوں نے ایک دوسرے کے بعد کمرے کی کھڑکی سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ان تینوں افراد نے خودکشی کے لیے جمعے کا دن اور شام چھ بجے کا وقت مقرر کیا تھا' حالانکہ ان تینوں میں کوئی بھی ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے والا نہ تھا' بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ان کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ پولیس کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے جس آدمی نے ہوٹل

ڈی فرانس کے کمرہ نمبر سات میں خودکشی کی وہ سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ اپ
ملک کی ایک معروف تجارتی فرم میں سیلزمین تھا اور کاروباری دورے پر فرانس آ
تھا۔ ریکارڈ سے صرف اتنا پتا چلا کہ اس نے ہوٹل ڈی فرانس کا کمرہ نمبر سات ایک
ہفتے کے لیے کرایے پر لیا۔ سارا دن وہ ہوٹل سے باہر رہتا اور شام کو واپس آتا۔

تین دن اسی طرح گزرے' چوتھے روز وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا
پانچویں روز علی الصبح ہوٹل کی مالکہ مادام ڈوبیں نے اسے چند لمحوں کے لیے کمر
سے باہر بے حد بے چینی کے عالم میں ٹہلتے پایا۔ مادام کو دیکھتے ہی وہ جلدی سے کمر
میں گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

اگلے روز بھی وہ باہر نہیں نکلا اور کھانا کمرے کے اندر ہی منگوا لیا۔ جمعے کا د
بھی یوں ہی گزرا' ہوٹل کے کسی ملازم نے اس سوئس کی شکل نہیں دیکھی۔ م
تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے تمام دن کھانے کے لیے کچھ منگوایا نہ پینے کے لی
ایک دوبار ہوٹل کا ملازم کمرہ نمبر سات کی طرف گیا۔ دروازے پر دستک بھی دی' لیکن
اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا' مگر دروازہ ا
سے حسب معمول بند تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگائے لیکن کوئی آواز سنائی
دی۔ یہ صورت حال عجیب تھی۔ ملازم نے فوراً" ہوٹل کی مالکہ مادام ڈوبیں کو اطلا
دی۔ مادام نے خیال کیا کہ شاید کمرہ نمبر سات کا مسافر کسی سبب سے سو گیا ہے' لہٰ
اسے بے آرام نہ کیا جائے' لیکن شام چھ بجے بازار کے رخ لوگوں کا ہجوم ہو گ
معلوم ہوا کہ کمرے کی ایک کھڑکی سے مسافر کی لاش لٹک رہی ہے۔

پولیس آئی' کمرہ نمبر سات کا دروازہ توڑا گیا۔ سوئس سیلزمین کی لاش کھڑکی
لگے ہوئے آہنی ہک سے لٹک رہی تھی۔ اس کے گلے میں اس سرخ رسی کا پھندا
ہوا تھا جو اسی کمرے میں پردوں کو کھینچنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ لاش کا چہرہ
ہو چکا تھا' زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل آئی تھیں
ڈاکٹروں نے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد اعلان کیا کہ اس شخص کی موت

اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔

پولیس کی سرتوڑ کوشش کے باوجود خودکشی کے اسباب کا پتہ نہ چل سکا اور یوں یہ معاملہ داخل دفتر کر دیا گیا' لیکن ابھی اس حادثے کو پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ ہوٹل ڈی فرانس کے کمرہ نمبر سات میں ایک اور شخص نے خودکشی کرلی۔ یہ بھی جمعے ہی کا دن تھا اور وقت وہی شام چھ بجے........ اس مرتبہ لوگوں نے کھڑکی کے ساتھ جو لاش لٹکتے دیکھی' وہ کسی گمنام یا معمولی آدمی کی لاش نہ تھی۔ وہ ملک کا نامور اسٹیج اداکار' کارل کراز تھا۔ نوجوان' خوبصورت اور وجیہہ آدمی........ ہروقت خوش و خرم رہنے والا' شہر میں اس کی کسی سے دشمنی نہ تھی' ہر شخص اس کا مداح تھا۔ کارل ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ اپنا مکان چھوڑ کر اسے ہوٹل ڈی فرانس کے کمرہ نمبر سات میں قیام کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ غالباً" وہ اپنی تجسّس طبیعت کے باعث مجبور ہو کر یہاں آیا ہو گا کہ اس کمرے میں ایک شخص خودکشی کر چکا تھا۔ کارل کو عجیب اور پراسرار معاملات میں دخل دینے کی عادت تھی۔ بہرحال کئی دن تک شہر میں اس دوسری واردات کا چرچا رہا۔ کارل نے بالکل اسی طریقے سے خودکشی کی تھی جس طرح سوئس سیلزمین نے اپنے آپ کو پردے کی سرخ رسی کے ذریعے موت کے حوالے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پہلی واردات کو اتفاقیہ کہہ کر نظرانداز کیا جا سکتا تھا' لیکن دوسری واردات کو جو بعینہٖ پہلی واردات کا نمونہ تھی' محض اتفاق کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ پولیس کو یقین تھا کہ ان وارداتوں کے پیچھے ضرور کوئی گہری سازش کام کر رہی ہے' لیکن پولیس کے بہترین دماغ بھی اس سازش سے پردہ نہیں اٹھا سکے۔

پولیس کمشنر نے بالآخر خود ان وارداتوں کی تحقیق کا ارادہ کر لیا۔ جہاندیدہ افسر نے مادام ڈوبیں سے کہا کہ وہ خود کمرہ نمبر سات میں کچھ وقت گزارنے کا خواہش مند ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح کوئی نکتہ' کوئی راز ہاتھ آئے' مادام کو بھلا کیا اعتراض ہو

سکتا تھا' اس نے پولیس کمشنر کو اجازت دے دی۔ ہوٹل کے رجسٹر اندراج کے مطابق پولیس کمشنر اتوار کی صبح اپنے ساتھ ایک سوٹ کیس لے کر آیا اور کمرہ نمبر سات میں ٹھہر گیا۔ سوٹ کیس میں اس کے چند کپڑے تھے اور ایک ریوالور۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ ہر روز صبح اور شام دونوں وقت وہ کمرے سے باہر نکلتا' اپنے علاقے کے پولیس سٹیشن جاتا اور دوسرے بڑے افسروں کو بتاتا کہ کمرے میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہاں کسی "قاتل" یا بھوت پریت کا سایہ بھی نہیں دیکھا گیا نہ کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ ہوٹل ڈی فرانس کے جیسے اور کمرے ہیں' ویسا ہی کمرہ نمبر سات بھی ہے' لیکن بدھ کے دن شام کو کمشنر جب پولیس سٹیشن میں داخل ہوا تو اس کا رنگ فق تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ماتحت افسروں نے اسے جلدی سے پانی پلایا۔ پانی پی کر کمشنر کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ خودکشی کی وارداتوں کا راز جاننے میں کامیاب ہو گیا ہے' مگر فی الحال چند ضروری ثبوت درکار ہیں۔ یہ ثبوت فراہم ہونے کے بعد وہ ساری رپورٹ لکھے گا۔

جمعرات کے روز وہ معمول کے مطابق پولیس سٹیشن نہیں پہنچا' چنانچہ اس کے ماتحت نے ہوٹل ڈی فرانس کی مالکہ مادام ڈوبیں کو فون کیا اور کمشنر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ مادام نے بتایا کہ کمشنر آج سارا دن کمرے میں بند رہا ہے اور باہر نہیں نکلا' تاہم گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہوٹل کا ایک ملازم تھوڑی دیر پہلے کھانا لے کر گیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ کمشنر بالکل ٹھیک ٹھاک ہے' البتہ یہ غیر معمولی بات ضرور دیکھنے میں آئی کہ اس کا چہرہ کسی نامعلوم جوش اور جذبے کے باعث انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

پولیس کمشنر جمعے کی صبح بھی کمرہ نمبر سات سے باہر نہیں آیا۔ مادام ڈوبیں نے جب دروازے پر دستک دی تو اندر سے کمشنر نے غرا کر کہا کہ کون ہے۔ مادام نے اپنا نام بتایا تو کمشنر نے جواب میں کہا کہ ابھی میں زندہ سلامت ہوں اور خودکشی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ سن کر مادام واپس آ گئی' مگر شام کے ٹھیک چھ بجے اسی کھڑکی کے

ہک سے کمشنر کی لاش لٹکتی ہوئی دیکھی گئی۔ اس تیسری لرزہ خیزواردات سے سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور ہوٹل کے آگے ہزاروں افراد جمع ہو گئے۔ ہوٹل میں قیام پذیر تمام مسافر کمرے خالی کر کے جا چکے تھے' حتیٰ کہ ایک دو کے سوا تمام ملازم بھی بھاگ گئے تھے اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ہوٹل میں داخل ہو سکے۔ یہ طے کر لیا گیا کہ کمرہ نمبر سات آسیب زدہ ہے اور پولیس کے پاس چونکہ آسیب سے لڑنے کا کوئی طریقہ نہیں' اس لیے ان وارداتوں کے بارے میں کی جانے والی تحقیق کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ پولیس کے محکمے میں سخت دہشت پھیل چکی تھی۔ کوئی چھوٹا بڑا افسر ہوٹل ڈی فرانس کا رخ کرنے کو آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ تاہم عوام کی طرف سے بار بار مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھایا جائے۔ کوئی آسیب یا بدروح انسانوں کو قتل نہیں کیا کرتی اور نہ انہیں خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔ ان ہولناک واقعات کے پیچھے ضرور کسی مجرم کا ہاتھ ہے۔

اس مطالبے سے مجبور ہو کر پولیس نے اعلان کیا کہ عنقریب ان وارداتوں کی ازسرنو تفتیش کی جائے گی۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی دلیر اور نڈر آدمی آگے آئے جو رضاکارانہ طور پر کمرہ نمبر سات میں رہنے کے لیے تیار ہو اور وہاں رہ کر جو کچھ دیکھے' وہ روزانہ ایک ڈائری میں قلم بند کرتا رہے تاکہ جمعے کی شام اس کی متوقع خودکشی کے تمام واقعات ڈائری کے ذریعے پولیس کے علم میں آ سکیں۔

پولیس نے یہ اعلان کر دیا لیکن اس جان لیوا تجربے کے لیے عوام میں سے کوئی شخص سامنے نہ آیا۔

تین ہفتے گزر گئے۔ ہوٹل ڈی فرانس ویران پڑا تھا۔ کوئی مسافر اس میں قیام کرنے کے لیے نہیں آیا۔ ہوٹل کی مالکہ مادام ڈوبیں سخت پریشان اور ہراساں تھی۔ اس نے اپنی طرف سے اعلان کیا کہ جو بہادر شخص ایک ہفتے کے لیے کمرہ نمبر سات میں قیام کرے گا اسے نہ صرف ہوٹل کی طرف سے مفت کھانا اور دوسری آسائشیں

فراہم کی جائیں گی' بلکہ ایک سوطلائی اشرفیاں بھی انعام میں ملیں گی۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان مادام ڈوبیں کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام رچرڈ مونٹے ہے' وہ میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے اور اسے اگر کمرہ نمبر سات میں رہنے کی اجازت دی جائے تو وہ ان وارداتوں کے اسرار سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔

مادام ڈوبیں نے اسے اعلیٰ حکام کے پاس بھیج دیا......... رچرڈ مونٹے نے کمرہ نمبر سات منتقل ہونے سے پیشتر پولیس کی تحقیق و تفتیش پر مشتمل مختلف کارروائیوں کی رپورٹ بے حد غور سے پڑھی جو اس دوران میں تیار کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی رو سے کچھ باتیں انتہائی حیران کن تھیں وہ یہ کہ ہر فرد نے جمعے کے روز شام کے چھ بجے خودکشی کی' خودکشی کے لیے پردوں میں استعمال کی جانے والی سرخ رسی کا پھندا بنایا گیا' ہر لاش کے پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے منہ میں سے ایک بڑی مکڑی برآمد ہوئی۔ یہ مکڑی زندہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو جاتی رہی۔ کوئی شخص ان باتوں کی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا تھا۔ رچرڈ مونٹے نے یہ تمام حقائق ذہن نشین کیے اور کمرہ نمبر سات میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت ہوٹل ڈی فرانس میں اس کے سوا کوئی اور مسافر مقیم نہیں تھا۔ رچرڈ کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچانے کے لیے ایک دو ملازم مقرر تھے جو مقررہ اوقات پر آتے اور یہ چیزیں اس کے کمرے میں پہنچا کر فوراً" واپس چلے جاتے۔ رچرڈ نے اپنی ڈائری میں جو اندراج کیے' ان کی تفصیل یہ تھی۔

۲۸ر فروری ۱۸۸۰ء

میں کل شب ہی ہوٹل ڈی فرانس کے کمرہ نمبر سات میں منتقل ہوا ہوں' ہر طرف سناٹا تھا۔ یہاں اس وقت کوئی متنفس نہیں تھا۔ پچھلے دنوں یکے بعد دیگرے تین افراد نے اس کمرے کی کھڑکی سے لٹک کر خودکشی کی ہے' لیکن کوشش کے باوجود پولیس پتا نہیں چلا سکی کہ خودکشی کے محرکات کیا تھے۔ تینوں آدمی جو اس بھیانک فعل

کے مرتکب ہوئے' بظاہر تندرست تھے اور جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے' ان سب کا بیان ہے کہ انہیں کوئی ذہنی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ بہرحال میں اسی نیت سے یہاں آیا ہوں کہ ان وارداتوں کا سراغ لگانے میں پولیس کی مدد کر سکوں۔ یوں بھی مجھے آسیب زدہ مکانوں میں رہنے اور بدروحوں سے ملاقات کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اگر کمرہ نمبر سات میں بھی ایسے ہی حالات رونما ہو رہے ہیں تو مجھے توقع ہے کہ بہت جلد کسی بدروح سے آمنا سامنا ہو گا۔

گزشتہ رات مجھے خاص گہری نیند آئی' حتیٰ کہ کوئی خواب تک دکھائی نہ دیا۔ آج صبح نو بجے کے لگ بھگ ہوٹل کی مالکہ مادام ڈوبیں میرے لیے خود ناشتہ لے کر آئی اس کی حالت خاصی ابتر ہے۔ بے چاری عورت......... خودکشی کی اوپر تلے تین پراسرار وارداتوں نے اس کا سارا کاروبار ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یہاں کوئی شخص ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ میں نے مادام کو تسلی تشفی دی اور کہا کہ وہ غم نہ کرے' خدا نے چاہا تو بہت جلد اس کا ہوٹل آباد ہو جائے گا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی میرا چہرہ تکتی رہی۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔

مجھے احساس ہے کہ جس کام میں مَیں نے ہاتھ ڈالا ہے، وہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم مجھے اپنے ہوش و حواس پر قابو پائے رکھنا ہو گا۔ یہ سارا کھیل ہی اعصاب پر کنٹرول رکھنے کا ہے۔ مجھ سے پہلے جو تین آدمی خودکشی پر آمادہ ہوئے' اس کی واحد وجہ یہی ذہن میں آتی ہے کہ انہیں کسی نامعلوم سبب سے اپنے اعصاب پر قابو نہ رہا تھا اور جب اعصاب پر قابو نہ رہے تو ذہنی صلاحیتیں بھی ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ بہرحال اگر میں نے یہ معمّہ بے نقاب کر دیا تو سوطلائی اشرفیاں میری پڑھائی اور دوسرے اخراجات کے لیے بہت ہیں۔ پولیس والے بھی خوفزدہ ہیں۔ انہوں نے اگرچہ میری خاصی ہمت بندھائی' لیکن ان میں سے کسی نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ گاہے بگاہے یہاں آ کر مجھے دیکھتا رہے گا۔ انہوں نے مجھے ایک بھرا ہوا پستول ضرور دیا ہے' لیکن میرا خیال ہے مجھے یہ پستول استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر

فی الواقع اس کمرے میں آسیب کا کچھ اثر ہے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے کچھ اور ذرائع اختیار کرنے ہوں گے۔ بظاہر میں نے اس کمرے کو خوب دیکھا بھالا ہے' مجھے ابھی تک کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ آسیب زدہ مکانوں کے بارے میں میں نے بہت کثرت سے سنا ہے کہ ان کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی ہے اور انسانوں کے اعصاب اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر اس کمرے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

یکم مارچ ۱۸۸۰ء

"ایک دن اور ایک رات قطعی خیریت سے گزر گئی۔ کسی قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ آج میں سارا دن کمرے کی کھڑکی کے رخ بیٹھا بازار کا نظارہ کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ہر راہ گیر ادھر سے گزرتے ہوئے اس کھڑکی کی طرف نگاہ ضرور اٹھاتا ہے۔ کئی تماشائی رک بھی جاتے ہیں اور مجھے حیرت و خوف سے دیر تک تکتے رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں میں کوئی آسیب ہوں۔ میں نے ایک دوبار ان تماشائیوں کی طرف ہاتھ ہلایا' لیکن اس حرکت سے وہ اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ فوراً" ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ مادام ڈوبیں میرے لیے خود ناشتہ اور کھانا تیار کر کے لاتی ہے۔ آج جب وہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے کے علاوہ سرخ رنگ کی ایک نئی رسی بھی تھی۔ اس نے یہ رسی خود پردے سے باندھ دی ہے۔ جب میں نے ہنس کر اس سے پوچھا کہ معلوم ہوتا ہے ایسی کئی رسیاں آپ کے پاس اور ہیں تو وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ میں نے جھٹ اسے پانی کا گلاس پلایا' تب اس کے ہوش و حواس درست ہوئے۔

دوپہر کو وہ کھانا لائی۔ کھانا بہت لذیذ اور وافر مقدار میں تھا۔ میں نے مادام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اتنا زیادہ کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ وہ یہ سن کر چپ رہی۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر میں نے مادام ڈوبیں سے پوچھا کہ اس

کمرے میں یکے بعد دیگرے خودکشی کرنے والوں کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ غالباً" یہ سوال مادام ڈوبیں سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ ایک دم چونک گئی۔ میں نے دیکھا اس کے خشک ہونٹ لرز رہے ہیں۔ بے حد خوفزدہ ہو کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا' پھر کہنے لگی۔

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ان وارداتوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص واقعہ ضرور ہے۔ سوئس سیلزمین کے بارے میں تو میں نہیں بتا سکتی کہ اس نے خودکشی کس سبب سے کی۔ البتہ اسٹیج اداکار' کارل کراز کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک ایکٹریس کو چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا' لیکن ایکٹریس نے کارل کی محبت ٹھکرا دی۔ اسے اس بات کا بڑا رنج تھا۔ پولیس کمشنر کی خودکشی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ پچھلے دنوں اس کے بارے میں سنا گیا تھا کہ وہ ایک مہلک عارضے کا شکار ہے۔ پہلے بھی اس نے ایک بار مایوس ہو کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔"

مادام ڈوبیں کے یہ انکشافات میرے لیے تعجب کا باعث ہیں۔ موقع ملا تو میں اعلیٰ حکام سے ان کی تصدیق کروں گا۔ مجھے اس کمرے میں منتقل ہوئے دو دن اور دو راتیں بیت چکی ہیں۔ ابھی تک کوئی غیر معمولی یا مشکوک واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرا خیال ہے مادام ڈوبیں جو کچھ کہتی ہے' اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہو گی۔ کسی بھوت پریت یا بدروح کو میں نے اس کمرے میں منڈلاتے نہیں پایا۔ رات کو خوب مزے سے سوتا ہوں۔ میں اپنے ساتھ چند کتابیں لے آیا تھا۔ اب انہیں پڑھ رہا ہوں۔ کتابوں سے جی اکتاتا ہے تو کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہوٹل کی عمارت کے سامنے اب بھی تماشائیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ ان سب کی نگاہیں اسی کھڑکی پر جمی رہتی ہیں۔ یہ لوگ مجھے دیکھتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔

۲ مارچ ۱۸۸۰ء

"آج جمعے کا دن ہے........ وہی دن جب تینوں آدمیوں نے خودکشی کی۔ اس

تصور ہی سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ کیا خبر خودکشی کرنے والا چوتھا آدمی میں ہوں........! دوپہر کو مادام ڈوبیں بھنا ہوا مرغ لے کر آئی تھی۔ میں نے مزے لے لے کر کھایا۔ جب وہ خالی پلیٹیں لے کر واپس جا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ دفعتاً پلٹ کر کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور سوجی ہوئی۔ یقیناً وہ دیر تک روتی رہی تھی۔ میرے سامنے ہی وہ پھر رونے لگی۔ میں نے پوچھا' کیا بات ہے مادام آپ کیوں رو رہی ہیں؟ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں........ وہ نہیں چاہتی کہ میں بھی خودکشی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں........ وہ مجھے بالکل اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی ہے........ مادام ڈوبیں کی شفقت اور محبت دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر یک لخت میری نظریں اس سرخ رنگ کی رسی پر پڑیں جو پردے میں پروئی گئی تھی۔ رسی کو دیکھ کر پہلی بار میرے بدن میں خوف کی جھرجھری نمودار ہوئی۔ میں نے اٹھ کر رسی کا جائزہ لیا۔ یہ خاصی مضبوط تھی۔ اسے چھوتے ہی مجھے کچھ کراہت سی محسوس ہوئی۔ ایک ثانیے کے لیے یوں لگا جیسے میں اپنے ہاتھوں میں کسی جیتے جاگتے سانپ کو پکڑے ہوئے ہوں۔

جوں جوں شام قریب آ رہی ہے' میرے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگی ہیں۔ خدا معلوم اب کیوں میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں اسی کھڑکی کے قریب کھڑا رہوں۔ کھڑکی سے دور ہٹ کر مجھ میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہونے لگتی ہے۔ جونہی میں کھڑکی کے نزدیک جاتا ہوں' یہ بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ اب میں اپنے اندر ایک حیران کن تبدیلی پا رہا ہوں........

شہر کے نزدیکی گرجے کا گھڑیال شام کے چھ بجنے کا اعلان کر رہا ہے........ اور میں نے ابھی تک خودکشی نہیں........ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعے کے روز شام کے چھ بجے خودکشی کرنے والے تینوں افراد کے ساتھ جو کچھ بیتی' اس میں کسی بدروح کا

سبب کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان تینوں نے اپنے ارادے سے یہ فعل سرانجام دیا ہو گا۔
م ازکم میں تو یہی شہادت دے سکتا ہوں اگر ایسا نہ ہوتا تو اس وقت میری لاش بھی
س کھڑکی کے آہنی ہک سے لٹک رہی ہوتی۔

رچرڈ مونٹے کی یہ دلچسپ ڈائری دو مارچ کے اندراج کے بعد اچانک ۱۰مارچ
کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ اس نے تین' چار' پانچ '
' سات' آٹھ اور نو مارچ کے واقعات لکھنا ضروری خیال نہیں کئے۔

۱۰مارچ ۱۸۸۰ء

گزشتہ رات مجھے نیند بہت مشکل سے آئی' حالانکہ اس سے پیشتر میں رات کا
ھانا کھاتے ہی گہری نیند سو جاتا تھا......... مجھے دراصل اس کمرے سے انسیت ہو گئی
ہے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ شاید میں اس سبب سے پریشان ہو رہا ہوں
۔ اگر میں کچھ عرصے بعد خودکشی کی ان وارداتوں کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت
لیس کے اعلیٰ حکام کی خدمت میں پیش نہ کر سکا تو مجھے اس کمرے سے نکال دیا
ے گا اور وہ تمام سہولتیں مجھ سے چھین لی جائیں گی جو اب تک مجھے حاصل ہیں۔
س کے علاوہ میں ایک سو طلائی اشرفیوں کا وہ انعام بھی کھو بیٹھوں گا جو مادام ڈوبیں
نے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کا مطلب صریحاً" یہ ہو گا کہ مستقبل کے سارے سنہری
اب چکنا چور ہو جائیں۔ نہیں......... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا......... مجھے
قیمت پر ان پراسرار وارداتوں کا سراغ لگانا ہو گا۔

میں اپنے آرام دہ بستر پر لیٹا سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔ کروٹیں بدلنے کے
جود نیند نہیں آتی......... تب میں اٹھ کر لیمپ روشن کرتا ہوں اور قلم سنبھال کر
ئری لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں مجھے ایک عجیب واقعہ درج کرنا چاہیے۔ پہلے میں اس
ہم میں مبتلا رہا کہ شاید میرے تھکے ہوئے اعصاب کی کرشمہ سازی ہے' لیکن جب
بار وہی چہرہ سامنے دیکھتا ہوں تو یقین آ جاتا ہے کہ یہ میرا وہم نہیں ہے' وہ چہرہ جیتا

جاگتا میرے سامنے موجود ہے۔ بعض اوقات مجھے شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ چہرہ میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں اور اس سے اتنا مانوس ہو چکا ہوں کہ اب لمحہ بھر کی جدائی بھی میرے لیے ناقابل برداشت ہے اور میں اس کمرے سے رخصت ہونا پسند نہیں کروں گا۔ میں نے ابھی تک مادام ڈوبیں سے اس چہرے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ عورت اپنی پریشانی میں مبتلا ہے، میں اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

کمرہ نمبر سات کی اس کھڑکی کے عین سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان ہے۔ اس مکان کی دوسری منزل کے بیرونی کمرے کی ایک کھڑکی میں وہ چہرہ مجھے پہلے پہل نظر آیا تھا۔ یہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک حسین و جمیل لڑکی کا چہرہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ہے اور اس کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم کی کلیاں کھلی رہتی ہیں۔ جب میں اس کمرے میں آیا تھا تو ابتدائی دو دن گزرنے کے باوجود اس کا چہرہ میں نے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں آن کر کھڑی ہوتی ہو، مگر مجھے یاد نہیں۔

گزشتہ روز میں نے اسے پہلی بار دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر والہانہ انداز سے مسکرائی تھی اور میں بھی ہنس دیا تھا۔ پھر دن میں کئی مرتبہ وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں نظر آئی۔ ہر بار جب وہ آتی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو جاتا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں......... لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا نام کلارے مونڈے ہونا چاہیے۔ اگر یہ نام اس کا نہیں ہے، تب بھی یہی نام ہونا چاہیے کیونکہ کلارے مونڈے قدیم فرانسیسی زبان میں چودھویں شب کے چاند کو کہتے ہیں۔ یہ لڑکی بلاشبہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی روشنی آ جاتی ہے اور میں ایک نامعلوم مسرت کی دنیا میں گم ہو جاتا ہوں۔

۱۲؍مارچ ۱۸۸۰ء

"کلارے مونڈے مجھ میں بے حد دلچسپی لے رہی ہے۔ اب وہ کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی مجھے تکا کرتی ہے۔ آج سارا دن وہ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی مسکراتی

رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں ایک غریب اور مفلس طالب علم ہوں۔ کاش کلارے موندے کو خبر ہو کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے فی الحال اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ ابھی تو میں عشق و محبت کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کسی ذریعے سے کلارے موندے تک اپنے خیالات پہنچاؤں کہ وہ یوں کھڑکی میں بیٹھنا چھوڑ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو مجھے خود یہ کام کرنا ہو گا، یعنی میں کھڑکی بند کر دوں گا اور ادھر ہرگز نہ جاؤں گا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ نوخیز و نوجوان لڑکی اس وسیع و عریض مکان میں اکیلی رہتی ہے۔ میں نے پچھلے دو دنوں میں اس کے علاوہ کسی اور فرد کو اس مکان میں گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔ مکان کے بیرونی حصے میں تین کھڑکیاں ہیں اور میں دیکھتا ہوں کلارے موندے ہمیشہ درمیان والی کھڑکی میں آ کر بیٹھتی ہے۔ دائیں بائیں دونوں کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ آج اس نے ایک نرالی حرکت کی۔ وہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا نہایت خوب صورت چرخہ لے کر آئی اور مسکرا مسکرا سوت کاتنے لگی۔ کبھی کبھی گردن گھما کر میری طرف بھی دیکھتی جاتی تھی۔ پھر اس نے ایک اور دلچسپ شرارت کی، کھڑکی پر نہایت باریک ریشمی پردہ ڈال دیا لیکن اس پردے کے پیچھے سے مجھے اس کا ہیولا حتیٰ کہ اس کی دلنواز مسکراہٹ بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ گھنٹوں وہ وہیں بیٹھی چرخہ کاتتی رہی۔ میں حیران ہوں کہ وہ تھکتی کیوں نہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ وہاں سے اٹھ جاتی ہے، پھر میں دیر تک اپنی کھڑکی میں کھڑا اس کی واپسی کا منتظر رہتا ہوں لیکن وہ واپس نہیں آتی۔ تعجب اس امر پر بھی ہے کہ اس کے مکان میں کسی قسم کی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ ہو سکتا ہے شام ہوتے ہی وہ مکان کے پچھلے دروازے سے کہیں اور چلی جاتی ہو۔

ابتدا میں مجھے کلارے موندے کی صورت کچھ دھندلی نظر آتی تھی مگر اب اتنے فاصلے کے باوجود میں اس کے خال و خط بخوبی دیکھ سکتا ہوں......... وہ یقیناً دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک پیرس کے لوگوں کو اس کے

بارے میں پتہ نہیں چلا ورنہ وہ مجھے دیکھنے کے بجائے حسن و جمال کے اس مجسمے کو دیکھا کرتے۔ آخر وہ بھی تو سارا سارا دن بازار کے رخ' اپنے مکان کی کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہے؟

کلارے مونڈے کا قد دراز ہے۔ اس کے سیاہ ریشمی بال اتنے لمبے ہیں کہ کولہوں تک پہنچتے ہیں۔ وہ ان بالوں میں کبھی رومال نہیں باندھتی جیسا کہ فرانس کی اکثر لڑکیاں اپنے بالوں میں رومال باندھا کرتی ہیں۔ اس کا چہرہ صحت مند اور انتہائی سرخ و سفید ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس چہرے میں سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اسکی ناک ستواں ہے اور ہونٹ گلاب کی پتیاں' آنکھیں گہری نیلی ہیں اور ان میں سمندروں کی سی گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ ٹخنوں سے لے کر صراحی دار سفید گردن تک وہ ہمیشہ سیاہ ریشمی لباس پہنے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھی کالے دستانوں میں چھپا رکھے ہیں۔ یہ امر میری عقل سے بالا ہے کہ اس عمر میں وہ سیاہ لباس کیوں پہنتی ہے۔ کیا اسے کوئی غم ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کا چہرہ اندوہ گیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس وہ برابر مسکراتی رہتی ہے۔ ایک دوبار میں نے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں مگر میرا اشارہ پاکر بھی وہ کچھ نہ سمجھی بلکہ مسکراتی رہی۔ بہرحال ایک نہ ایک دن میں کلارے مونڈے سے مل کر ہی رہوں گا۔

۱۴ مارچ ۱۸۸۰ء

میں محسوس کرتا ہوں کہ جسم و جاں کی قوتیں آہستہ آہستہ مضمحل پڑتی جا رہی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کمرے میں گزشتہ کئی دنوں سے اکیلا رہ رہا ہوں۔ اگرچہ مجھ پر باہر جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلارے مونڈے میرے دل و دماغ پر پوری طرح قبضہ جما چکی ہے۔ میں دن بھر کھڑکی کے قریب بیٹھا اسی کو تکتا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی خبر ہے نہ اس میں دلچسپی' یہاں تک کہ مجھے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں نے صبح کا ناشتہ کب کیا اور

دوپہر کا کھانا کب کھایا۔ مجھے اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ کھانا لے کر میرے پاس کون آیا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہے۔ جس سے میں چھٹکارا بھی پانا چاہتا ہوں مگر کلارے مونڈے کی شکل دیکھے بغیر ایک پل کے لیے چین بھی نہیں ملتا۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ کھڑکی بند کر کے رخصت ہو جاتی ہے اور میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکتا۔ اس کا روئے زیبا میری نظروں کے سامنے رقص کرتا رہتا ہے۔ نیند نہ آنے کے باعث میں کوئی نہ کوئی کتاب لے کر لیٹ جاتا ہوں مگر کتاب کے حروف یک لخت غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ کلارے مونڈے کی صورت سامنے آ جاتی ہے۔ ایک دوبار میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ میرے بستر کے قریب کھڑی ہے لیکن جب اٹھ کر غور سے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ خدا مجھ پر رحم کرے' سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار ہے۔

۱۶ مارچ ۱۸۸۰ء

آج میں یہ ڈائری بھی بڑی مشکل سے لکھ پا رہا ہوں۔ ذہن قطعی ساتھ نہیں دے رہا۔ باربار کوئی نادیدہ قوت میرا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ مجھے بالکل یوں لگ رہا ہے جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے مگر اسے دیکھنے سے قاصر ہوں۔ گذشتہ رات نہ جانے کس وقت میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اتنا یاد ہے کہ کلارے مونڈے مجھے خواب میں دکھائی دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی سرخ رسی تھی اور وہ مجھے دکھا دکھا کر اس کا پھندا بنا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کچھ کہا جسے میں صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا۔ تاہم اس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس بلانے کی خواہشمند ہے۔ آج صبح جب میری آنکھ کھلی اور میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو خوف کی ایک زبردست جھرجھری میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ خدا کی پناہ......... کیا یہ میرا ہی چہرہ تھا؟ میں یقین نہیں کر سکا۔ گال پچکے ہوئے' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں ناک کا بانسا کس قدر ٹیڑھا ہو چکا ہے۔ میں نے پچھلے تین روز سے شیو بھی نہیں بنائی۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھ رہے تھے۔ پھر دفعتہ" آئینے میں

سے میری صورت غائب ہو گئی......... اور میری صورت کی جگہ......... آئینے میں کلارے مونڈے کی جھلک نظر آنے لگی۔ وہ اب بھی اسی تروتازہ چہرے کے ساتھ مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔ میں نے آئینہ سامنے والی دیوار پر دے مارا اور سر تھام کر دوبارہ بستر پر جا گرا۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح بستر پر پڑا رہا۔ خواب کی مانند اتنا اور یاد ہے کہ کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی تھی' مگر مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھولتا۔ یقیناً" مادام ڈوبیں یا اس کا کوئی ملازم ناشتہ لے کر آیا تھا......... پے در پے دستک ہوتی رہی لیکن میں نے دروازہ نہ کھولا۔ اس وقت مجھ میں بولنے کی بھی سکت نہ تھی۔

بہت دیر بعد میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ کوئی پراسرار طاقت مجھے کھڑکی کی طرف دھکیل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مونڈے اپنے مکان کی کھڑکی میں بیٹھی حسبِ عادت میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ میں بھی اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے مزاج پرسی کی۔ اس نے بھی گردن کو جنبش دی اور ہنسنے لگی۔ اس کے نوکیلے چمک دار دانتوں سے کرنیں سی خارج ہوئیں اور میں نے دہشت زدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی چاہتا تھا میں کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر چلا جاؤں لیکن پیروں کی جان جیسے نکل گئی تھی۔ میں کلارے مونڈے کی طرف دیکھنے پر مجبور تھا۔

بعض اوقات میں یہ سوچنے پر بھی قادر نہیں ہوتا کہ مجھے ہوا کیا ہے۔ جادو ٹونے طلسمات پر مجھے یقین نہیں تھا لیکن جن حالات سے شب و روز میں گزار رہا ہوں' ان کی بنا پر اگر یہ کہوں کہ کلارے مونڈے نے مجھ پر جادو کر دیا ہے تو اس میں مبالغہ نہ ہو گا۔ جب تک میں اسے دیکھ نہ لوں میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی رہتی ہیں اور کانوں میں عجیب اذیت ناک سائیں سائیں سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن جونہی میں کھڑکی کے قریب جا کر اس کا چہرہ دیکھتا ہوں' یہ سب جسمانی اور روحانی اذیتیں دور ہو جاتی ہیں۔ ایک اور نرالی حقیقت بھی انہی دنوں مجھ پر روشن ہوئی ہے اور وہ یہ کہ جو

حرکت میں کرتا ہوں بعینہٖ ویسی ہی حرکت کلارے مونڈے کرتی ہے۔ مثلاً میں نے غیرارادی طور پر سر کھجایا' اسی وقت اس نے بھی سر کھجایا۔ میں نے رسی کو تھاما' اس نے بھی جھٹ سرخ رسی تھام لی۔ جب تک میں رسی پکڑے رہا وہ بھی رسی تھامے رہی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ باندھے' اس نے بھی ویسا ہی کیا۔ بے حد غور کرنے کے باوجود میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ میری ان حرکتوں کی نقل کیوں اتارتی ہے۔

۱۷مارچ ۱۸۸۰ء

''ایک اور جمعہ بخیرو عافیت گزر گیا ہے اور میں ابھی تک زندہ سلامت ہوں۔ یعنی میں نے خودکشی نہیں کی۔ مادام ڈوبیں مجھے صحیح سلامت پاکر خوش ہے۔ اس کا خیال ہے اگر میں کچھ عرصہ اور اس کمرے میں رہوں اور صحیح سلامت چلا آؤں تو ہوٹل کی بدنامی کا داغ کسی حد تک دور ہو جائے گا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اخبار ابھی تک ان پراسرار وارداتوں کے بارے میں طرح طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں چھاپ رہے ہیں اور ہوٹل کے اردگرد اخباری نامہ نگار منڈلاتے رہتے ہیں۔ کئی نامہ نگاروں نے مادام ڈوبیں سے درخواست کی ہے کہ وہ مجھ سے تھوڑی دیر کے لیے مل کر کمرہ نمبر سات میں قیام کے تاثرات معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کو اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے مادام کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلی گئی۔

ادھر میرا حال یہ ہے کہ خوراک برائے نام رہ گئی ہے۔ کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔ پچھلے دو دنوں میں میں نے صرف گنتی کے چند نوالے کھانے کے کھائے ہیں۔ مطالعہ کرنے کا شوق بھی فنا ہو چکا ہے۔ مطالعہ کیا خاک کروں جب بھی کتاب کھولتا ہوں' کلارے مونڈے کا چہرہ سامنے آ جاتا ہے اور حروف طرح طرح کی شکلیں بدل کر غائب ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلارے مونڈے کے سوا مجھے اور کچھ یاد نہیں ہے۔ شاید میں دیوان ہو گیا ہوں۔ گزشتہ روز جب مادام ڈوبیں کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کلارے مونڈے وہاں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میں جلدی سے اس کی طرف لپکا مگر وہ کلارے مونڈے نہیں تھی۔ وہاں مادام ڈوبیں ہاتھوں میں

ناشتے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر پیچھے ہٹی' اس کا پاؤں ایک کرسی سے ٹکرایا اور ناشتے کے برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے۔ پھر وہ چیختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر نہیں کھولا۔

جمعے کی شام چھ بجنے سے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے اندر زبردست ہلچل محسوس کی۔ کوئی ان جانی طاقت بار بار مجھے کھڑکی کی طرف دھکیل رہی تھی۔ ایک بار تو میں وہاں چلا بھی گیا اور سرخ رسی کا پھندا بنانے لگا۔ مگر عین اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور میرا دھیان بٹ گیا۔ میں نے آواز دے کر پوچھا' کون ہے؟' اس کا جواب نہیں آیا۔ البتہ دستک برابر جاری رہی۔ میں نے دیکھا کمرے کی دیواریں لرز رہی ہیں اور جا بجا رکھا ہوا فرنیچر بھی جنبش میں ہے۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے سرخ رسی چھوڑ دی اور دروازے کی طرف آیا۔ اسی لمحے دستک کی آواز رک گئی۔ لرزتی ہوئی دیواریں تھم گئیں اور جنبش کرتا ہوا فرنیچر اپنی اصل حالت میں آ گیا۔ میں نے تھوڑی دیر بعد اپنی طبیعت میں سکون پایا۔ اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے لیمپ روشن کر دیا اور کھڑکی کی طرف گیا۔ کلارے مونرے اپنی کھڑکی میں نہیں تھی۔ سورج ڈوبنے کے بعد وہ نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے ایک بار بھی مکان سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے!

۱۹ مارچ ۱۸۸۰

میں حیران ہوں کہ روز ہی نت نئے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ آج صبح کئی دن بعد کمرے کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں گیا تھا۔ کمرے کے دروازے اور برآمدے کی چھت کے درمیان میں نے مکڑی کا ایک بہت بڑا جالا دیکھا۔ اتنا بڑا جالا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جالے کے بالکل درمیان میں ایک ہیبت ناک مکڑی بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ وہ خاصی بڑی تھی۔ اتنی بڑی مکڑی عام طور پر دیکھی نہیں جاتی۔ اسے دیکھ کر میرا دل آپ ہی آپ دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مکڑی کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں اور میرا بدن بے حس و حرکت ہوتا جا رہا

ہے۔ کوشش کے باوجود میں وہاں سے جنبش نہیں کر سکا۔ مکڑی اپنے جالے میں چلتی ہوئی آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی اور بالکل میری ناک کے سامنے آن کر ٹھہر گئی۔ اسے اپنے اتنے قریب پا کر مجھے جو نفرت اور کراہت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس مکڑی کی آنکھیں بھی غیر معمولی طور پر بڑی ہیں اور ان میں خون کی سی سرخی جھلک رہی ہے۔ مکڑی چند لمحے وہیں رک کر مجھے تکتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے جالے کے اندر واپس چلی گئی۔ میں یہ سطریں لکھتے ہوئے اب بھی حیران ہوں کہ اس مکروہ مخلوق کو میں نے ہلاک کیوں نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت مجھ میں ایسا کرنے کی قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔

دفعتہً میں نے ایک اور منظر دیکھا جو اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ نہ جانے کدھر سے ایک مکڑا ادھر آ گیا اور جالے کے آس پاس گھومنے لگا۔ اس نے جالا توڑ کر اندر جانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر وہ ہیبت ناک مکڑی خود حرکت کرتی ہوئی جالے کے آخری کنارے تک پہنچی اور مکڑے کو اپنے ساتھ کر لے درمیان میں اسی جگہ واپس آ گئی جہاں پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ دیر تک وہ دونوں پاس پاس بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ اس کے بعد میرے دیکھتے دیکھتے اس مکڑی نے جو اپنی جسامت کے اعتبار سے مکڑے سے دگنی دکھائی دیتی تھی مکڑے کو اپنی لمبی لمبی سوئی کی طرح باریک ٹانگوں میں بری طرح جکڑ لیا۔ مکڑا اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپنے لگا لیکن اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ ہر لحظہ اس پر مکڑی کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ آخر مکڑا بے جان نظر آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ مکڑے کے جسم کے درمیانی ابھرے ہوئے حصے سے خون بہہ رہا ہے۔ مکڑی نے اپنا منہ لگا کر پہلے یہ خون چوسا' پھر رفتہ رفتہ مکڑے کی ٹانگیں الگ الگ کر کے ہڑپ کر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں مکڑے کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

۲۱ مارچ ۱۸۸۰ء

''میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بازار میں جمع ہونے والے تماشائیوں کا

ہجوم کم ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً" پیرس کے لوگ اس ہوٹل میں وقوع پذیر ہونے وا
وارداتوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اب مجھے بس اکا دکا آدمی ہی بازار میں کھڑا دکھائی
ہے۔ یوں بھی دھیان سارا دن کھڑکی میں بیٹھی کلارے مونڈے کی طرف ہی لگا ر
ہے۔ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی وہ روز کی طرح اپنے مکان کی کھڑکی میں
جاتی ہے اور سورج ڈوبنے تک مسلسل وہیں بیٹھی مسکراتی رہتی ہے۔ میں حیران ہو
کہ وہ کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا وقت کب نکالتی ہے۔ میں نے اس عرصہ
میں اسے کچھ کھاتے یا پیتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا لباس وہی ہے جو اول روز میں
اس کے نازک بدن پر دیکھا تھا۔

ان دنوں ہم دونوں عجیب و غریب بچگانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ وہ کھڑکی م
آتے ہی ہنستی ہے اور اسے دیکھ کر میں بھی ہنس دیتا ہوں۔ پھر میں اپنے دونوں ہا
کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیتا ہوں وہ بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ سیاہ دستا
میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی خوب صورتی کے بارے میں کوئی با
نہیں بتا سکتا۔ پھر میں اپنے کندھے اچکاتا ہوں۔ ہونٹوں کو حرکت دیتا ہوں۔ م
جھوٹ موٹ کی کنگھی پھیرتا ہوں۔ کلارے مونڈے بھی بعینہ یہ تمام حرکتیں دہرا
ہے اور ساتھ ساتھ مسکراتی رہتی ہے۔ اب مجھے یقین کامل ہے کہ ہم دونوں کے ما
ایک دوسرے کو سمجھنے اور عمل کرنے کی پراسرار قوت کام کر رہی ہے۔ میں نے
بار اس کا تجربہ کیا ہے اور کبھی اسے غلط نہیں پایا۔ اکثر اوقات وہ اتنی سرعت
میری حرکتوں کی ہوبہو نقل کرتی ہے کہ میں بھونچکا ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مثلاً" کل
میں نے اپنی گردن ہلاتے ہلاتے ایک دم بازو ہلانے شروع کر دیئے۔ کلارے مونڈ
بھی میری دیکھا دیکھی گردن ہلا رہی تھی۔ جونہی میں نے گردن کی حرکت روکی۔
نے بھی بالکل مشینی انداز میں اپنی ہلتی ہوئی گردن روک دی اور بازو ہلانے لگی۔
ایک ثانئے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں کٹھ پتلیاں ہیں اور ہمارے تار
اور ہاتھ میں ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۸۸۰ء

یہ حسینہ جس کا نام میں نے کلارے موندے تجویز کیا تھا۔ واقعی کلارے موندے ہی نکلی۔ اس امر پر مجھے اتنی حیرت ہے کہ بیان سے باہر۔ پہلی مرتبہ میں نے اس کے مکان کے دروازے پر لکڑی کی چھوٹی سی پلیٹ لگی دیکھی ہے۔ اس پلیٹ پر نمایاں حروف لکھا ہے۔ "کلارے موندے۔" ایک اور بات جس کا مجھے خاص تجسس ہے وہ یہ کہ سورج غروب ہونے کے بعد سے طلوع سحر تک کلارے موندے مجھے نظر نہیں آتی۔ یقیناً" وہ کہیں اور چلی جاتی ہو گی' ورنہ دکھائی ضرور دیتی۔ دوسری بڑی پراسرار بات میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ رات بھر کلارے موندے کا مکان تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے۔ میں نے اس تمام مدت میں ایک بار بھی وہاں روشنی کی کوئی کرن نہیں دیکھی۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ مادام ڈوبیں سے اس بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔ شاید وہ کچھ بتا سکے کہ یہ لڑکی کلارے موندے کون ہے اور اس کے حالات کیا ہیں۔ لیکن اب یاد کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے گزشتہ کئی دنوں سے مادام ڈوبیں کو بھی نہیں دیکھا اور نہ اس کا کوئی ملازم میرے لیے ناشتہ لے کر آیا۔ خدا رحم کرے کیا اتنے دنوں تک میں کچھ کھائے پیئے بغیر ہی جی رہا ہوں؟ اگر ایسی بات ہے تو بہت ہی عجیب بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلارے موندے کی شخصیت کے سحر میں اس قدر گرفتار ہو چکا ہوں کہ کسی اور طرف تصور جاتا ہی نہیں۔ دن بھر وہ میری نگاہوں کے سامنے مسکراتی ہوئی موجود رہتی ہے۔ میں اس لڑکی کے بارے میں اب بے حد سنجیدگی سے طے کر رہا ہوں کہ اس سے ضرور ملوں گا اور پوچھوں گا کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے اور اس مذاق کا مطلب کیا ہے۔ لیکن یہ سوچتے سوچتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید میں کلارے موندے کا اتنا قرب برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ ہو سکتا ہے خوشی سے میرے دل کی حرکت ہی بند ہو جائے۔ طب کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے اکثر ایسے واقعات دیکھے اور سنے ہیں جن میں انسان شادئ

مرگ سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ پھر میں سوچتا ہوں مجھے اتنا نزدیک پا کر اس کی کیفیت ہو گی؟ ہو سکتا ہے وہ مجھے آتا دیکھ کر کہیں چھپ جائے اور مکان کا دروازہ نہ کھولے۔ یہ سطریں میں لیمپ کی مدھم روشنی میں لکھ رہا ہوں۔ لیمپ میں جلنے والا روغن بس ختم ہونے والا ہے شاید ایک دو دن اور نکال جائے' اس لیے میں لیمپ تھوڑی دیر کے لیے ہی جلاتا ہوں۔ دیوار پر میرا سایہ پڑ رہا ہے۔ میں کچھ دیر ادھر رکتا ہوں......... دفعتہ" مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے علاوہ بھی اس کمرے میں کوئی موجود ہے۔ میں اگرچہ اسے دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کی خوشبو ضرور محسوس کر رہا ہوں......... اب مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا......... وہ یقیناً" کلارے موندے ہے......... یہ بھی اس کی ایک ادا ہے جسے میں بخوبی جاننے لگا ہوں۔

۲۳ر مارچ ۱۸۸۰ء

آج جمعے کا دن تھا جو بخیر و عافیت گزر گیا۔ شام کے چھ بجے مجھ پر اضطراب اور بے چینی کی ایک زبردست کیفیت ضرور طاری ہوئی تھی اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کھڑکی کے قریب جاؤں' پردے میں بندھی ہوئی سرخ ریشمی ڈوری کھولوں' اس کا پھندا بناؤں اور کلارے موندے کا تصور کرتے ہوئے اس پھندے کو اپنی گردن میں ڈال لوں۔ ایک دوبار میں نے کھڑکی کے پاس جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن یوں لگتا تھا جیسے میرے بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ کوشش کے باوجود میں کھڑکی کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکا۔ پڑھنے والے یقین نہیں کریں گے مگر میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' اسے جھٹلانا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں تین لاشوں کو اس کھڑکی میں آہنی ہک سے لٹکتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ان میں پہلی لاش سوئس سیلزمین کی ہے' دوسری اسٹیج اداکار کارل کراز کی اور تیسری پولیس کمشنر کی۔ ان تینوں لاشوں کے چہرے بھیانک ہیں۔ آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی' منہ کھلے ہوئے۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر مجھے ایک متحرک شے بھی دکھائی دے رہی ہے۔ اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ یہ تو وہی مہیب مکڑی ہے جسے میں نے کئی دن قبل دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اپنی

جسامت سے تقریباً" پانچ گنا بڑی نظر آتی ہے۔ اس کی ننھی منھی زرد آنکھیں مجھ پر جمی ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری پیشانی اور تمام چہرہ پسینے میں تر ہو چکا ہے۔ مکڑی آہستہ آہستہ دیوار پر حرکت کرتی ہوئی واپس اپنے جالے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں وہ پرے ہٹتی جاتی ہے' میری جان میں جان آ رہی ہے۔ میں قطعی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ مکڑی کہاں سے آئی اور اسے دیکھ کر میری یہ کیفیت کیوں ہو جاتی ہے۔

۲۶ مارچ ۱۸۸۰ء

آج ایک اور انوکھا انکشاف مجھ پر ہوا وہ یہ کہ میں کلارے مونڈے کے مختلف اشاروں پر چلتا ہوں۔ اس سے پہلے میں اس وہم میں مبتلا تھا کہ وہ میرے اشاروں پر چلتی ہے اور جیسی حرکتیں میں کرتا ہوں ویسی ویسی حرکتیں وہ دہراتی ہے۔ میں نے اسے تنگ کرنے کے لیے پانچ ایسی حرکتیں اختیار کیں جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ فوری طور پر ان کی نقل نہیں کر سکے گی۔ اپنی یہ نئی حرکتیں میں نے ڈائری میں بھی درج کر لی تھیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب کلارے مونڈے ان حرکتوں کی نقل نہ کر پائے گی تو وہ کس قدر شرمندہ ہو گی۔ علی الصبح میں کھڑکی کے پاس گیا تو وہ اپنی کھڑکی میں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حسبِ معمول مسکرائی۔ میں بھی مسکرایا' پھر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا۔ اس نے بھی اسی انداز میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کے فوراً" بعد میں نے وہ تمام جسمانی حرکات شروع کر دیں جو میری دانست میں خاصی مشکل تھیں اور جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ کلارے مونڈے انہیں دہرا نہ سکے گی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے ایک ثانئے کی تاخیر کے بغیر من و عن وہ تمام حرکات دہرائیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے پہلے ہی سے علم ہو چکا تھا کہ میں کیا کرتب دکھانے والا ہوں۔

اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا مادام ڈوبیں

وہاں موجود تھیں۔ پہلی نظر میں میں اسے پہچان نہیں سکا۔ ایک عظیم تغیر اس کی حالت میں رونما ہو چکا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کئی برس بوڑھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال چاندی کے تاروں کی طرح سفید پڑ گئے تھے اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں آئی اور ایک دم مجھ پر کسی درندے کی طرح جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے نکیلے ناخنوں سے میرا منہ نوچ لیا۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت سے میں قطعی بدحواس ہو گیا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر اپنا بچاؤ کر سکوں، مادام ڈوبیں نے دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔ اس وقت وہ ایک خونخوار بلا کے روپ میں میرے سامنے کھڑی غرا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ میرا گلا دبانے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ میں نے خاصی جدوجہد کے بعد اسے پرے دھکیلا اور مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ جب وہ بے ہوش ہو گئی تو میں نے اسے گھسیٹا اور کمرے کے باہر پھینک دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں دوبارہ کھڑکی کی طرف گیا۔ کلارے مونڈے وہاں موجود تھی مگر اس مرتبہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی نہیں بلکہ سنجیدگی اور متانت سے مجھے تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ناراضی اور غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ میں واپس اپنے بستر پر آن کر بیٹھ گیا اور اپنی ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میرے سامنے وہ صفحہ کھلا ہوا تھا جس پر میں نے کلارے مونڈے کو پریشان کرنے کے لیے پانچ چھ نئی جسمانی حرکتیں ایجاد کر کے درج کی تھیں اور جنہیں میں اپنی دانست میں تھوڑی دیر پہلے کر چکا تھا۔ یہ جان کر میں سخت مضطرب ہوا کہ ان حرکتوں میں سے میں نے ایک حرکت بھی نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں کلارے مونڈے کی حرکتوں کا تابع تھا۔ جو کچھ وہ کرتی تھی وہی میں کرنے پر مجبور تھا۔ اس انکشاف سے میری حالت غیر ہو گئی اور میں نے کہا شاید میں زندگی بھر کلارے مونڈے کے اشاروں ہی پر چلتا رہوں گا۔ میں نے ایک بار پھر اسے آزمانے کا ارادہ کیا۔ بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے نزدیک گیا۔ کلارے مونڈے وہیں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے اپنی انگلی اٹھا کر ناک

نے کی کوشش کی لیکن میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا ہاتھ غیرارادی
پر کھڑکی کی چوکھٹ پر لگا۔ میں نے ہاتھ وہاں سے ہٹایا اور اسے اپنی قمیض کے
ر کرلیا اور دل میں طے کرلیا کہ خواہ کچھ ہو' میں یہ ہاتھ باہر نہیں نکالوں گا۔ مگر
رے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ خود بخود قمیض سے باہر آ رہا ہے۔
نے نظریں اٹھا کر کلارے مونڈے کو دیکھا وہ مسکرا رہی تھی اور اس کا ہاتھ حرکت
رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور واپس آ کر دھڑام سے
پر گر پڑا۔

۳۰ مارچ ۱۸۸۰ء

میری گھڑی بند پڑی ہے۔ مجھے خبر نہیں کیا بجا ہے۔ پچھلے چار پانچ دنوں سے
اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ میں نے اس دوران میں رات کے وقت ڈائری میں
راج کیا تھا مگر صبح کو اٹھ کر جب ان اوراق کا جائزہ لیا تو وہاں ایک حرف نہیں تھا۔
م صفحے خالی پڑے تھے۔ یہ ایسا عجیب قضیہ ہے کہ میں اس کی توجیہہ کرنے سے قاصر
وں۔ میں کھڑکی میں سارا دن کھڑا رہا ہوں اور کلارے مونڈے بھی سارا دن میری
ہوں کے سامنے رہی ہے۔ آج وہ بار بار مکان میں جاتی اور واپس آتی۔ میں نے
کھا وہ بے حد خوش ہے۔ آج وہی جمعے کا دن ہے اور سورج غروب ہونے میں آدھ
منٹ باقی ہے۔ یہ اندازہ میں نے خود لگایا ہے ہو سکتا ہے وقت اس سے بھی کم ہو۔
دیکھ رہا ہوں کہ کلارے مونڈے کی کھڑکی پر بھی ویسا ہی پردہ پڑا ہوا ہے جیسے
رے کمرے کی کھڑکی پر ہے اور اس پردے میں بھی سرخ رنگ کی ریشمی ڈوری
ھی ہوئی ہے۔ میری جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے وہ یہ ریشمی ڈوری پردے میں سے
ینچ لیتی ہے۔ اب وہ اس کا پھندا بنا رہی ہے۔ پھندا مجھے دکھا کر وہ اسے کھڑکی کے
ی ہک سے باندھ رہی ہے۔ میرا دل اس زور سے دھڑک رہا ہے کہ ابھی اچھل کر
نے سے باہر آ جائے گا لیکن میں ٹکٹکی باندھے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ کوئی ان دیکھی
ت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں بھی وہی کروں جو کلارے مونڈے کر رہی ہے۔ میں

سخت الجھن اور ذہنی کش مکش سے دوچار ہوں۔ میری قوت ارادی سلب ہ
ہے۔ مجھے بہرحال وہی کرنا ہے جو کلارے موندے کر رہی ہے۔ میں اٹھ کر کھ
طرف جاتا ہوں۔ ریشمی ڈوری کو ہاتھ لگاتے ہی ایک سرد لہر میرے بدن میں دو
ہے۔ میں کچھ کچھ حواس میں ہوں۔ واپس آکر قلم سنبھالتا ہوں اور ڈائری لکھ
شروع کرتا ہوں۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کھڑکی کی جانب بالکل نہیں دیکھ
کلارے موندے کے اشاروں پر نہیں چلوں گا۔ ورنہ......... مجھے بھی خود کش
پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

نوجوان طالب علم رچرڈ مونٹے کی ڈائری یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہ
اپریل کو اس کے کمرے کا دروازہ توڑا جاتا ہے۔ اسی کھڑکی میں رچرڈ مونٹے کی
لٹک رہی ہے۔ اس نے پردے کی سرخ ریشمی ڈوری کا پھندا بنا کر اپنی گردن م
اور خود کشی کر لی۔ اس کے چہرے پر دہشت' اضطراب اور اذیت کے ملے جلے
پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آچکی تھیں۔ دونوں ہونٹ نچ
تھے' جیسے کسی نے انہیں تیز دھار آلے سے کاٹنے کی کوشش کی ہو۔ پیشانی پر خ
ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ ڈائری کے اوراق سے پتا چ
سامنے والے مکانوں میں کوئی لڑکی کلارے موندے رہتی ہے۔ پولیس کے اعل
اس مکان میں لڑکی سے ملنے گئے۔ دروازہ بند تھا۔ دستک دینے پر ایک بوڑھا
کھانستا ہوا باہر آیا۔ اس نے حیرت سے پولیس والوں کو دیکھا اور بتایا کہ یہ مکان گ
ڈیڑھ دو برس سے خالی پڑا ہے اور کلارے موندے نام کی کوئی عورت یہاں ن
رہتی۔ پولیس افسران نے مکان کی تلاشی لی بوڑھا درست کہہ رہا تھا۔ اوپر کے ک
میں دھول جمی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ البتہ انہوں نے
کمرے کی بیرونی کھڑکی کے قریب مکڑی کا ایک بہت بڑا جالا ضرور دیکھا۔ جالے
عین درمیان میں ایک غیر معمولی جسامت کی مکڑی بے حس و حرکت بیٹھی اپنی زرد

ـوں سے گھور رہی تھی۔

اس حادثے کو ایک صدی بیت چکی ہے۔ طالب علم رچرڈ مونٹے کی ڈائری کے
خوردہ اوراق آج بھی پیرس کے میوزیم میں موجود ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں
سکتا ہے۔

*

دنیا کی واحد یونیورسٹی جہاں جاسوسی سکھائی جاتی ہے

اگر آپ کو کبھی ماسکو کی سیاحت کا موقع ملے اور خوش قسمتی سے کریملن کے قریب جانے کا اتفاق ہو تو اس تاریخی عمارت کے سائے میں ایک سہ منزلہ چھوٹی سی عمارت آپ کو دکھائی دے گی' جس کا برآمدہ بہت چھوٹا ہے اور جس کی طرف جانے والے راستے پر سنگ مرمر کے ٹکڑے بچھے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت 1775ء میں تعمیر کی گئی تھی اور کبھی یہاں شاہی افسر رہا کرتے تھے' لیکن آج یہ عمارت دنیا میں جاسوسی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ کے' جی' بی کے محکمہ خارجہ کے ڈائریکٹر کا نجی دفتر ہے۔ کے' جی' بی روس کے سراغ رسانوں کا محکمہ ہے۔ اس دفتر کے ذریعے روس کے خفیہ ایجنٹوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور اسی دفتر سے ایجنٹوں کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں اور یہیں سے انہیں ان کے مقاصد سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

دنیا بھر سے آنے والی تمام رپورٹوں کی ترتیب اسی دفتر میں ہوتی ہے اور اسی جگہ ان کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ اسی دفتر کے ذریعے کے' جی' بی کے دوسرے محکموں کے ساتھ سراغ رسانی کے کام کے بارے میں رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ یہی دفتر فوجوں کے جنرل اسٹاف اور حکومت کے دوسرے محکموں کے درمیان تعلق پ

رکھتا ہے۔ اس محکمے سے متعلق جو کام ہے' اسے روسی زبان میں "تحقیق و تفتیش" اور "اندازے قائم کرنا" کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ اس محکمے کے متعدد فرائض کو بڑی اچھی طرح بیان کرتے ہیں۔ ان کا کام صرف فوجی اور سیاسی ریشہ دوانیاں کرنا ہی نہیں' بلکہ یہ محکمہ ہر اس ملک کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے' جس میں روس دلچسپی لے رہا ہو۔

روس کا نظام سراغ رسانی دوسرے ممالک کے جاسوسی نظام سے یوں منفرد ہے کہ اس کی افرادی طاقت بہت زیادہ اور اس کا حلقۂ عمل تقریباً" غیر محدود ہے۔ یہ لوگ بے شمار کام کرتے ہیں۔ سوویت یونین اور اس کے طفیلی ممالک کی طرف سے دو لاکھ پچاس ہزار مرد عورتیں اس نظام کے تحت کام میں مصروف ہیں۔ جاسوسوں کی یہ عظیم فوج دس ہزار تربیت یافتہ اور انتہائی نامور جاسوسوں کی قیادت میں کام کرتی ہے۔ آج سے چند سال قبل جاسوسوں کی اس فوج پر روس پانچ کروڑ پونڈ سالانہ خرچ کرتا تھا' لیکن موجودہ صورت حال میں یہ اندازہ بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ بایں ہمہ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں' جو اپنی اتنی افرادی اور اقتصادی دولت کو سراغ رسانی کے لیے وقف کر دے۔

روسی جاسوسوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ تعداد کی یہ زیادتی بھی ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں فوجی طور پر بھی روس نے یہی پالیسی اختیار کی تھی اور دشمن کو "انسانی سمندر" میں غرق کرنے میں کامیاب ہوا تھا' اب یہی پالیسی جاسوسی کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کل وقتی کام کرنے والے افسروں اور خفیہ ایجنٹوں کی اس فوج کی وجہ سے بعض موقعوں پر انہیں شکست بھی کھانا پڑی ہے اور ایجنٹوں کی اچھی خاصی تعداد گرفتار بھی ہو گئی ہے اور ان سے ایسی اہم دستاویز بھی ملی ہیں' جن سے مغربی ممالک کو اس نظامِ سراغ رسانی کے طریقِ کار کی پوری تفصیلات کا ٹھیک ٹھیک علم ہو گیا ہے۔ یہ ایجنٹ کے' جی' بی کے دفتر کو بعض اوقات "آلے" کا نام دیتے ہیں اور یہ غلط بھی نہیں' کیونکہ بہرحال یہ ایک بہت بڑی مشین ہی تو ہے۔

کئی بڑے بڑے جہازی سائز کے دفتری بلاکوں میں بارہ محکمے کام کر رہے ہیں۔ یہ محکمے افسران بالا اور ماتحت افسروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں جدید طریقِ کار کا ہر سامان موجود ہے۔ فائل رکھنے کی جدید ترین مشینوں سے لے کر فوٹو گرافی کا پورا اسٹوڈیو اس کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ عاملہ کا محکمہ بیرونی ممالک میں اشتراکی جال کے تار و پود تیار کرتا اور ان کا پورا انتظام کرتا ہے۔ اسی محکمے کے ذریعے مقامی ڈائریکٹر مقرر کئے جاتے ہیں' اسی کے احکام سے ایجنٹوں کو ملازمت دی جاتی ہے۔ یہ ایجنٹ لاتعداد تربیت گاہوں کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پکڑا جائے یا کسی کا راز فاش ہو جائے تو اس صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی یہی محکمہ میدان میں آتا ہے۔

سوویت یونین کے اندر یہ ایجنٹ ہوٹلوں کے بیرے' رپورٹر' ٹیکسی ڈرائیور' سوچ بورڈ کے آپریٹر یا گائیڈ کی حیثیت سے کام کرتے اور روس میں سیاحت کے لیے آنے والے غیر ملکیوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ اطلاعات کی بہم رسانی کا ذمہ دار محکمہ الگ ہے۔ خبروں کے لیے حکومت روس کی پیاس ناقابل تسکین ہے اور یہ محکمہ اس پیاس کو تسکین دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

سوویت یونین سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے' حکومت کی توجہ کے قابل ہے۔ غیر ممالک کے متعلق افواہیں اور گپ شپ بھی اسی طرح جمع کی جاتی ہیں اور اسی محنت سے انہیں ترتیب دیا جاتا ہے' جس محنت سے حقائق اور اعداد و شمار کو جمع کیا جاتا ہے۔ اس محکمے کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ خفیہ ایجنٹوں کے ذریعے حاصل کی ہوئی خبروں کا خلاصہ ہر روز تیار کر کے وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کرے۔ خفیہ محکمے کے ساتھ پورا تعاون بھی کے' جی' بی کے فرائض میں داخل ہے۔ خفیہ محکمے کا کام ضروری پاسپورٹ اور کاغذات تیار کرنا ہے' یہی محکمہ اپنے ایجنٹوں کے نام اور عرف متعین کرتا ہے۔ اسی کا کام "یا کاز" (چھپنے کے خفیہ اڈے) مہیا کرنا ہے۔ یہ پوسٹ بکس کے نمبر لیتا اور خط و کتابت کے خفیہ پتے تیار کرتا ہے اور کاروباری اداروں کی شکل میں

کام کرنے کے "محاذ" قائم کرتا ہے۔ محکمہ مواصلات کے اشتراک کے ساتھ یہ کارکنوں اور جاسوسوں کی نگرانی بھی کرتا ہے۔

ایک اور اہم محکمہ وہ ہے' جس کی وساطت سے ریذیڈنٹ' ڈائریکٹروں اور بیرون ملک کام کرنے والے ایجنٹوں کے درمیانی رابطے کو کنٹرول کرتا ہے۔ ایک مخصوص ریڈیو سیکشن بھی ہے جو مختلف ممالک کی آواز سننے کے لاتعداد سٹیشنوں پر مشتمل ہے۔ اس ریڈیو سیکشن میں "شارٹ وِیو" کے ایسے ماہرین موجود ہیں جو روس میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

محکمہ تربیت کے زیرِ نگرانی متعدد سکول قائم ہیں' جن میں فنِ جاسوسی کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ ان سکولوں کے علاوہ کئی کالج ہیں جن میں "نو آبادیاتی" ممالک اور "غلام" ممالک سے آنے والے طلبہ کو داخل کیا جاتا ہے۔ روس میں ایسے دو سو سکول اور کالج ہیں۔ جن میں صرف سراغ رسانی کا فن سکھایا جاتا ہے اور حفاظتی پولیس افسروں کو تربیت دی جاتی ہے۔ 1959ء-1958ء میں ان سکولوں میں جس طرح تعلیم دی جاتی تھی' اس کی تفصیل میرے قبضے میں ہے اور میرے پاس یہ بات ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ 259 کے بعد سے ان طریقوں میں کوئی بڑی تبدیلی کی گئی ہو گی۔ یہ سلیبس چار بڑے کورسوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے کورس کا عنوان "عمومی سیاسی معلومات" ہے۔ اس کورس میں اشتراکیت کے اصول و ضوابط کے علاوہ روس کی تاریخ کا مطالعہ شامل ہے۔ دوسرے کورس کا عنوان ہے' "طبقاتی دشمن' جس کے خلاف ہم نبرد آزما ہیں۔" اس کورس میں سرمایہ کار ممالک کی سیاسی اور صنعتی تنظیموں کی تفصیلات بتائی جاتی ہیں اور سرمایہ کار ممالک کی عسکری تنظیم کے متعلق تعلیم دی جاتی ہے۔ تیسرا کورس زیادہ مشکل اور زیادہ فنی ہے۔ اس میں مختلف چالیں چلنے کی تربیت دی جاتی ہے اور شورش پیدا کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ پروپیگنڈہ کرنے کے ڈھنگ کی تعلیم بھی اس کے ساتھ ہے۔ زیرِ تربیت جاسوس نظریاتی علم کو اچھی طرح سے رٹ لینے کے بعد فنی کورس

میں مہارت حاصل کرتا ہے۔

غیر ملکی زبانیں' جغرافیہ' نقشوں کا پڑھنا اور نقشہ کشی' اشارے اور خفیہ حروف زبانیں پڑھنا' انہیں سمجھنا اور استعمال کرنا' مواصلات میں مہارت اور خبر رسانی کے لیے مختلف آلات پر کامل عبور اور دسترس' ٹائپ' شارٹ ہینڈ' ٹیلی پرنٹنگ' ریڈیو ٹیلی گرافی' فوٹوگرافی اور مائیکروگرافی اس کورس میں شامل ہے۔

وہ بیرونی ممالک میں تحقیق و تفتیش کے دفاتر کے انتظام اور طریق عمل سے پوری واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ اپنے ملک کے سیاسی مندوبین اور دوسرے ملکوں کے مندوبین کے باہمی تعلقات کے بارے میں اسے پوری طرح آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اطلاع دہندوں کے ساتھ ربط' پاسپورٹ پہنچانے کے لیے دستاویزیں' نازک صورت حال میں عمل کرنے کے طریقے' گرفتار ہو جانے' دستاویزوں کے کھو جانے' پولیس کے چھاپے' تلاشی اور راز کھل جانے کی صورت میں فوری بچاؤ کی تدبیریں وغیرہ' ان سب کی پوری تربیت دی جاتی ہے۔

سب مرحلے طے ہو جانے کے بعد جاسوس کو میدان میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ کام کرنے کا طریقہ' دائرے کی وسعت' ہدایات' رپورٹیں اور فرائض کی طرف توجہ اور نفسیاتی مسائل سے اسے متعارف کرایا جاتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تربیت خاصی مکمل اور ہمہ گیر ہے۔ کسی بات کو اتفاقات کے سپرد نہیں کیا جاتا۔ ایجنٹ کو گھومنے پھرنے اور بات چیت کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے اور اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ اسے جو کچھ سکھایا گیا ہے وہ اسی طرح عمل کرے۔ اس سے بعض صورتوں میں مقصد تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس طریق تربیت میں خطرے بھی موجود ہیں۔ اگر ایجنٹ ایسے حالات میں گھر جائے' جو اسے تربیت دینے والوں نے قبل از وقت تصور نہ کیے ہوں تو وہ شل اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ حال ہی میں روسی ماہرین کو اس امر کا احساس ہوا ہے کہ تربیت دینے کا یہ سخت اور شدید طریقہ خطرناک ناکامیوں کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

بیرونِ ملک زندگی بسر کرنے والے ایجنٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں میں خوب گھل مل جائے' جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہے' روسی جاسوسوں کے لیے یہ خاص طور پر ضروری ہے۔ اور جو امریکہ کے دیہاتوں اور قصبوں میں رہتے ہیں' اس مقصد کو پانے کے لیے جاسوسوں کے نگرانِ اعلیٰ ایک حیران کن تجویز پر عمل کیا' جو بظاہر خاصی کامیاب ہو رہی ہے۔ انھوں نے جنوبی یوکرائن میں وِنٹسزا کے مقام پر ایک امریکی شہر آباد کیا ہے۔ یہ شہر صرف تربیت پانے والے جاسوسوں کے لیے ہے اور ان کے علاوہ کوئی شخص وہاں نہیں جا سکتا' لیکن ایک مرتبہ ایک امریکی فوجی افسر میجر پرسنجرن وہاں جا پہنچا۔ یہ شخص روسی ایجنٹ کے بھیس ہی میں وہاں گیا' یہ اور بات ہے کہ اسے بعد میں شناخت کر لیا گیا اور عبرتناک سزا دی گئی۔

میجر پرسنجرن کے بیان کے مطابق یہ "کوکا کولا شہر" دو سو گھروں پر مشتمل ہے اور امریکہ کے کسی بھی ایک بازار والے قصبے سے مشابہہ ہے۔ اس میں شراب خانے بھی ہیں اور دوا خانے بھی۔ ایسے سینما بھی ہیں جن میں امریکی فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور ان میں اسی قسم کے جذبات انگیز پوسٹر بھی لگائے جاتے ہیں جو امریکی فلموں کی نمائش کا وطیرہ ہیں۔ بیس بال کھیلنے کا میدان ہے' جس میں دو ٹیمیں بیس بال کھیلتی ہیں۔ یہ ٹیمیں اس کھیل میں مشاق ہیں۔ امریکی طرز کے پٹرول پمپ بھی ہیں اور خالص امریکی انداز کی حجاموں کی دکانیں اور جوئے خانے ہیں۔

اس عجیب و غریب پس منظر میں امیدوار جاسوسوں کو امریکی طرزِ زندگی کے بارے میں ہر وہ بات بتائی جاتی ہے' جسے جاننا ایک جاسوس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس تربیت کے اختتام پر لازمی ہے کہ ہر امیدوار ایک عہد نامے پر دستخط کرے۔ عہد نامہ یہ ہے۔

"مَیں زیرِ دستخطی........ اپنے دستخطوں کے ذریعے اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ مَیں مملکت روس کے لیے خفیہ کام کرنے کے متعلق تمام ہدایات حاصل کرنے کے بعد' عہد کرتا ہوں کہ میں ہر اس قانون اور ضابطے کی پابندی کروں گا۔ تو ان

ہدایات کے ذریعے مجھے سکھائے گئے ہیں۔ میں اپنے کام کے بارے میں ہر چیز کو قطعی طور پر خفیہ رکھوں گا اور میں اس بات کو کبھی ظاہر نہیں کروں گا کہ مجھے خفیہ کاموں کے لیے ملازم رکھا گیا ہے۔ میں مزید عہد کرتا ہوں کہ اپنے محکمے کو کوائف کی ہر اس تبدیلی کے متعلق اطلاع دیتا رہوں گا جو اس سے قبل میری داخل کردہ رپورٹ میں ہو گی اور خاص طور پر اپنے ان رشتے داروں اور دوستوں کے متعلق اطلاعات بہم پہنچاؤں گا' جن کے تعلقات غیر ملکیوں کے ساتھ ہوں گے یا جو ملک سے باہر ہوں گے میں اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ ان تمام قوانین' ضوابط اور اصولوں کا تعلق میرے خفیہ کام سے ہو گا۔ بے توجہی' بے پروائی یا اس عہد نامے کے متعلق کسی قسم کی عہد شکنی کی پوری قانونی ذمے داری میرے سر عائد ہو گی۔ لیکن یہ ذمے داری عدالت سے باہر ہو گی اور میری کوتاہیوں پر جو سزا مجھے دی جائے گی' میں اس پر کوئی احتجاج نہ کروں گا۔"

*

ایک جانباز جاسُوس عورت

سچ جانئے جب میں آنکھیں بند کر کے اپنے ماضی کے پُراسرار واقعات یاد کرتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ خود مجھ پر بیت چکے ہیں۔ اپریل ۱۹۴۴ء کی وہ بھیانک رات انیس سال بعد مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے، جیسے کل ہی کا ذکر ہو۔ وہ رات میری زندگی کی ان گنت ناقابل فراموش راتوں میں سے ایک تھی، جنہیں میں بھلانا چاہوں تو نہیں بھلا سکتی۔ جب رات کے پُراسرار سناٹے میں، مَیں نے ایک بمبار طیارے سے پیراشوٹ باندھ کر فرانس کی حدود میں چھلانگ لگائی تھی۔ مجھے وہاں ایک برطانوی جاسوس کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے تھے۔ فرانس پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ٹھہریئے مَیں شروع سے آپ کو یہ رام کہانی سناتی ہوں۔

دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ ہٹلر کی فوجیں ایک بلائے ناگہانی کی طرح ہر ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ ایک دن اخبار کے مطالعہ کے دوران میں میری نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ طبی امداد کے لیے نرسوں کی ضرورت تھی۔ مَیں نوکری کی تلاش میں پہلے ہی سے تھی، یہ موقع ہاتھ سے کھونا حماقت تھی۔ ملازمت کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ امیدوار فرانسیسی زبان روانی سے بول سکے۔ مجھے پہلے ہی فرانسیسی

زبان سے لگاؤ تھا اور مَیں فرانسیسی لہجے میں آسانی سے گفتگو کرسکتی تھی۔ نہایت سخت آزمائش کے بعد مجھے منتخب کرلیا گیا۔ منتخب شدہ قریباً" تیس لڑکیاں تھی۔ ہم کو "سرے" میں "تربیت" کے لیے بھیج دیا گیا۔ نرسنگ کورس کا تو صرف ایک بہانہ تھا' دراصل ہم کو جاسوس بننے کی تربیت دی گئی تاکہ ہم لوگ جرمن فوجوں میں خوف و ہراس پھیلائیں اور ان کے جنگی منصوبوں کا سراغ لگائیں۔

تربیت کے دوران میں ہمیں فرانسیسی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہماری قریباً" ہر عادت کو انہوں نے فرانسیسی انداز میں ڈھال دیا۔ ہماری معمولی معمولی حرکات کی بھی کڑی نگرانی کی جاتی تھی' حتیٰ کہ کھانا کھانے کے بعد یہ تک دیکھا جاتا تھا کہ ہم چمچے اور چھریاں فرانسیسی انداز میں رکھتے ہیں یا نہیں اور جو لڑکی غلطی سے "انگریزی حرکات" کا ارتکاب کر بیٹھتی تو اسے سختی سے ڈانٹ پڑتی تھی۔

ایک رات میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھا میرے بستر کے قریب ایک افسر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "آرام کرو۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ کہیں سوتے میں تم بڑبڑاتی تو نہیں اگر بڑبڑاتی ہو تو کس زبان میں۔"

ہم کو مشق کرائی جاتی کہ ہجوم میں کھڑے کسی ان دیکھے فرد کو صرف اس کی شخصی رپورٹ سے کس طرح پہچانا جاتا ہے یا کسی اجنبی کو ایک نظر دیکھ کر یا اس سے تھوڑی سی گفتگو کر کے اس کے کردار کے متعلق صحیح اندازہ کس طرح لگایا جاتا ہے۔

ہم کو چوری کرنا بھی سکھایا جاتا۔ کسی مقفل کمرے سے یا جس پر کڑا پہرہ ہو کس طرح چیزیں چرائی جاتی ہیں یا کسی دراز میں سے کوئی کاغذ اس طرح نکالنا کہ باقی کے کاغذ بالکل اسی طرح دراز میں پڑے رہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا کہ عام مستعمل چیزیں کسی دکان سے لے کر کس طرح آتش گیر مادے میں تبدیل کی جاتی ہیں۔ یہ تمام قواعد یکے بعد دیگرے ہمارے ذہن نشین کرائے گئے۔

ہم کو بڑی سخت جسمانی ورزشیں کرائی جاتیں تاکہ گرفتاری کی صورت میں ہم

بڑے سے بڑے تشدد کہ سہہ لیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان ورزشوں نے میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہم کو ہر ورزش مردوں کے معیار پر کرائی جاتی اور عموماً "ڈرل ماسٹر" کہا کرتا تھا۔ "دیکھو تم نے وہاں مرد جاسوسوں کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کی طرح سخت سے سخت کام کرنے ہیں اور اگر وقت آگیا تو اسی طرح دشمن سے لڑنا ہے جس طرح ہمارے مرد جاسوس لڑیں گے اور تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دشمن میدانِ جنگ میں عورت اور مرد کی تمیز نہیں کیا کرتا۔"

خدا خدا کر کے ہمارا کورس مکمل ہوا اور ایک دن مجھے ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوئی، کرنل نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور پھر مطمئن ہو کر بولا۔ "شاباش! جب تک تمہاری جیسی بہادر عورتیں ہماری قوم میں پیدا ہوتی رہیں گی، خدا نے چاہا تو ہم ہر مرحلے پر دشمن کو شکست دیں گے۔" پھر اس نے میری مہم کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔ "آج رات ہی کو تم' تمہارے ساتھ ایک وائرلیس آپریٹر اور ایک عمارت گرانے کا ماہر جائیں گے۔ لی مانز سے چالیس میل دور تم سب پیراشوٹ کے ذریعے اترو گے۔ لی مانز میں جنرل رومیل کی فوجوں نے کیمپ ڈال رکھے ہیں۔ وہاں جا کر تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ محبِ وطن فرانسیسیوں کی ایک مضبوط خفیہ جماعت بناؤ' ان کو باقاعدہ جنگ کی تربیت دو۔ تمہیں اس کے متعلق تمام ہدایات ہمارے ہیڈ کوارٹر سے خفیہ اشارات میں موصول ہوتی رہیں گی۔ دوسرا کام تمہارے ذمے یہ ہے کہ دشمن کی طاقت اور حرکات و سکنات کے متعلق تمام کوائف ہیڈ کوارٹر میں بھیجتی رہو۔" یہ کہہ کر کرنل نے دراز میں سے کچھ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ "یہ لو۔ اب تمہاری حیثیت ایک فرانسیسی لڑکی کی ہے۔ ان کاغذوں میں تمہارے فرانسیسی ہونے کے متعلق تمام کوائف درج ہیں۔ ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"

میں نے ان کاغذات پر درج ٹائپ شدہ عبارت پڑھنی شروع کر دی۔ اس میں لکھا تھا کہ اب میرا نام سوزانی بونوی ہے اور میرے والد کا نام السائنہ ہے۔

کا میری بونوی ہے۔ ہم لوگ نمبر ۱۰ اریوڈی۔ ریوائز' بونی ویلا میں رہتے تھے۔ اتحادیوں کی بمباری کے باعث ہمارا قصبہ تباہ و برباد ہو گیا تھا اور اب میں اپنے چچا زاد بھائی جین پال بونوی کے پاس جا رہی ہوں' جس کی لی مانز میں حویلی ہے۔

ابھی میں پڑھ ہی رہی تھی کہ کرنل نے میری طرف موم جامے کا ایک چھوٹا سا لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو اس میں جو سفید گولیاں ہیں وہ اس لیے ہیں کہ جب تم کسی مشکل میں پھنس جاؤ اور تھکن سے چور ہو جاؤ تو یہ گولیاں تم کو تقویت دینے کے کام آئیں گی اور یہ جو نیلا کیپسول ہے۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ صرف اس وقت کے لیے ہے جب تم دشمن کے قابو میں آ جاؤ اور بھاگ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جائیں' تو یہ صرف تین منٹ میں اپنا کام کر دے گا۔" اس کے یہ آخری الفاظ ایٹم بم کے دھماکے کی طرح کانوں سے ٹکرائے اور میں موت کے بھیانک خوف سے کانپ گئی۔ اسی رات ہم لوگ بمبار طیارے پر سوار ہو کر اپنی منزل مقصود کی طرف پرواز کر رہے تھے اور طیارے کی پرواز کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یکایک طیارہ بائیں طرف جھکا' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب ہم لوگوں کو کودنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ یہ مہم کا پہلا مرحلہ تھا۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' نیچے چاند کی شفاف و منور چاندنی میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ منظر مجھے اب ایک خواب کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اس چاندنی میں فرانسیسی بستیاں اس طرح دکھائی دیں' جیسے چھوٹے چھوٹے کھلونے پڑے ہوں اور مجھے اب کئی ہزار فٹ کی بلندی سے اس پُراسرار سناٹے میں کودنا تھا۔ میرا دل اور زور سے دھڑکنے لگا اور ہاتھ پیر سرد پڑنے لگے۔ میں سوچنے لگی کیا میں موت کے منہ میں تو نہیں جا رہی۔ دفعتہ" کرنل کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "تمہاری جیسی بہادر عورتیں جب تک ہماری قوم میں پیدا ہوتی رہیں گی ہم ہر مرحلے پر دشمن کو شکست دیں گے۔" اب میرے دل کو سکون تھا' ایسا سکون جو ہر محب وطن کے دل میں اپنے وطن کی حفاظت کے لیے قربانی دیتے وقت نمودار ہوتا ہے۔ میں نے اطمینان

کا سانس لیا اور جہاز سے چھلانگ لگانے کی تیاری کرنے لگی۔ پیراشوٹ اپنی کمر سے باندھ کر میں طیارے کے وسط میں آ کھڑی ہوئی۔ میرے پیچھے وائرلیس آپریٹر کھڑا تھا' اس کا فرضی نام الگزینڈر ڈیومنٹ رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی درمیانی عمر کا ایک باوقار شخص کھڑا تھا اس کا نام پال تھا۔ طیارے میں لال رنگ کا بلب روشن ہوا۔ اس کا مطلب تھا "کودنے کے لیے بالکل تیار ہو جاؤ۔" میں چھلانگ لگانے کے انداز میں کھڑی ہو گئی اور جیسے ہی سبز رنگ کا بلب روشن ہوا میں نے چھلانگ لگا دی۔

مجھے ایک جھٹکا محسوس ہوا اور اس کے بعد ہر چیز ساکن ہو گئی۔ حتیٰ کہ طیارے کی آواز بھی مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ طیارے سے چھلانگ لگاتے وقت میرا انداز صحیح نہ تھا۔ چار متواتر صحیح مشقیں کرنے کے بعد جب اصل وقت آیا تو مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی' ناقابل تلافی غلطی۔ مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

میں نے پیراشوٹ کی رسی کو جھٹکا دیا تاکہ وہ کھل جائے مگر خدا کی پناہ وہ گانٹھ میری توقع سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میں تیزی سے زمین کی طرف گرتی جا رہی ہوں۔

اسی کھینچا تانی کے دوران میں میرے ہاتھ سے وہ قیمتی بنڈل چھوٹ گیا جس میں میرے فرانسیسی کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ آپ شائد میرے اس اضطراب کا صحیح اندازہ نہ کر سکیں جو مجھ پر اس وقت طاری ہوا۔ "اگر یہ رسی نہ کھلی تو۔" اس سے آگے سوچنا بھی محال تھا۔ یکایک میرے پیروں سے کوئی سخت چیز ٹکرائی' اور اس کے بعد میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔

مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہی بس اتنا یاد ہے کہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے رات کے بیکراں سناٹے میں ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوتِ ارادی صرف کرتے ہوئے اپنے حواس درست کئے مگر وہ آوازیں سرگوشی سے زیادہ ہلکی تھیں۔ میں سوچنے لگی کہیں میں دشمن کے علاقے میں تو نہیں آ گری۔

چاروں طرف نظر دوڑائی تو میرے بائیں طرف درختوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آیا۔ میں لڑکھڑا کر اٹھی۔ پیراشوٹ ابھی تک میری پیٹھ کے ساتھ سختی سے چمٹا ہوا تھا۔

"دشمن کے علاقے میں اترتے ہی اپنا پیراشوٹ ضائع کر دو۔" میرے دماغ میں ہیڈکوارٹر کی ہدایت گونجنے لگی۔ میں نے اسے اتارنے کے لیے بہت تگ و دو کی مگر اس کمبخت نے بھی نہ اترنے کی قسم کھائی تھی۔ آخر چار و ناچار میں اسی طرح گھسٹتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ لمحات اس قدر پریشان کن تھے کہ میں اپنے آپ کو بے اختیار کوسنے پر مجبور ہو گئی کہ کیوں بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت مول لی۔ مگر اب پچھتانے کا کیا فائدہ تھا؟ رات کی گہری خاموشی میں ہونے والا وہ شور ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر شروع ہو گیا مگر اب آواز پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ میں نے کان لگا کر غور سے یہ آواز سنی تو انکشاف ہوا کہ یہ دراصل جرمن فوجوں کے ٹرکوں کی آواز ہے۔

ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے پورے زور سے آواز دی۔ "اینڈری" یہ دراصل اس شخص کا فرضی نام تھا جسے اس علاقے میں ہماری راہنمائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ میری آواز کے جواب میں مجھ سے تھوڑی دور درخت کے سوکھے پتوں پر کئی مدھم قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک آدمی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک اور نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے سامنے آٹھ آدمی کھڑے تھے۔ میں نے اپنا پستول مضبوطی سے پکڑ لیا اور سوچنے لگی کہ ان سے مزید کوئی بات کروں یا گولی چلا دوں۔ اتنے میں مجھے آواز سنائی دی' ایک شخص دوسرے سے فرانسیسی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "کوئی عورت ہے۔" اب آدمی میرے کافی نزدیک آ چکے تھے۔ میں نے درختوں سے چھنتی ہوئی چاند کی روشنی میں دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس یہ آٹھوں جوانی کی سرحد کو پھلانگ چکے ہیں۔

"اینڈری مر گیا........ نازیوں نے اسے تین دن ہوئے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔" بولنے والا اس لہجے میں بولا جیسے یہ کوئی اہم خبر نہیں۔ مجھے سامنے کھڑے

وگ دھندلے دکھائی دینے لگے' درخت گھومتے محسوس ہوئے۔ میں نے سوچا جس شخص سے مجھے یہاں ملنا تھا وہ تو مرچکا ہے اور اب میں ایسے لوگوں کے درمیان کھڑی ہوں جن سے ہر لمحہ موت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دو آدمیوں نے بڑھ کر چاقو سے میری کمر سے بندھے ہوئے پیراشوٹ کے تسمے کاٹے۔ ایک آدمی سے' جو حلیئے سے ان کا سربراہ دکھائی دیتا تھا' میں نے کہا۔

"دو آدمی اور میرے ساتھ پیراشوٹ کے ذریعے اترے ہیں اور میرا کپڑوں کا بنڈل بھی کہیں گر گیا ہے۔ براہِ کرم ان دونوں آدمیوں اور کپڑوں کے بنڈل کو تلاش کروائیے۔ اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اور اس شور کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جرمن فوجوں کا کانوائے جا رہا ہے۔" پھر اس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پایئرَی نے ہم لوگوں کو ابھی ابھی بتایا ہے کہ اس نے اس کانوائے کو جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر دیکھا ہے۔ یہ ایک لمحے کے لیے سڑک پر پڑے کسی بنڈل کو اٹھانے کے لیے رکا اور پھر چل پڑا۔ میرے خیال میں تم میں سے ہی کسی ایک کا ہو گا۔" یہ سنتے ہی میں سر سے پیر تک کانپ گئی تو دشمنوں کو پتہ چل جائے گا کہ ایک جاسوس ان کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور وہ بھی ایک عورت۔ اس پر ستم یہ ہو گا کہ کپڑوں سے وہ میرے جسم کا صحیح اندازہ بھی کر لیں گے۔

"اب ہمیں جلدی اس علاقے سے دور ہو جانا چاہیے۔" آواز میرے کان سے ٹکرائی اور غیرارادی طور پر میرے قدم اٹھ گئے۔ اب ہمارا رخ ٹرکوں کے شور کی مخالف سمت کی طرف تھا۔ دور دور تک پھیلی ہوئی چاندی میں میں نے دیکھا کہ وہ سب لوگ میرے انداز سے کہیں زیادہ بوڑھے تھے۔ ابھی میں ان کے بڑھاپے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ ان میں سے ایک بولا۔ "ہم بڈھوں کا صرف یہ کام ہے کہ جو لوگ جہازوں کے ذریعے یہاں اتریں ان کو منزل مقصود پر پہنچا آئیں اور ہمارے جوان اس سے زیادہ اہم کام سرانجام دیتے ہیں۔"

تمام رات ہم لوگ چلتے رہے اور جب مشرق کے دریچے سے طلوعِ آفتاب پہلی کرن جھانکتی ہوئی دکھائی دی تو ہم لوگ ایک سڑک پر چل رہے تھے۔ اب صرف تین تھے ہمارے بقیہ ساتھی جنگلوں میں کہیں چھپ چکے تھے تاکہ اتنے سار آدمی اکٹھے دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو۔

جب سورج آسمان پر ذرا بلند ہوا تو فضا کافی گرم ہو گئی۔ میرے کپڑوں کے میرے جسم سے بندھی ہوئی دس لاکھ فرانسیسی کرنسی نوٹوں سے بھری ایک پٹی تھی ا اس گرمی میں یہ پٹی اٹھائے پھرنا ایک شدید عذاب سے کم نہ تھا۔

تیس گھنٹوں تک ہم بغیر کھائے پیئے چلتے رہے یہاں تک کہ سورج ہمارے پر آگیا۔ آخر ہم لوگ بونوی کی حویلی پر پہنچے' وہاں ہم سے پہلے ہی الگزینڈر اور پا پہنچ چکے تھے۔ بڑی گرم جوشی سے انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور یہاں پہلی بار م نے اپنے فرضی چچازاد بھائی بونوی کو دیکھا۔ وہ ایک تنومند خوبرو جوان تھا اور بمشکل م سے دو یا تین سال بڑا ہو گا۔

اس روز ہم نے مکمل آرام کیا اور دوسرے دن ہی میری دوہری زندگی کا آغا ہو گیا۔ ایک طرف فرانسیسی جوانوں کو جنگی قواعد و اصول بتانا اور دوسری طرف جرم افسروں سے روابط پیدا کر کے جنگی راز معلوم کرنا ـــــ یہ دو بڑے کام تھے جو مجھے سرانجام دینے تھے۔ مجھے تمام ان خاص خاص آدمیوں کے گھر لے جایا گیا' جہاں س میں اطلاعات حاصل کر سکتی تھی اور وقت پڑنے پر پناہ بھی حاصل کر سکتی تھی۔ ناز سپاہی ہر [illegible] کتوں کی طرح پھرتے رہتے تھے۔ ہوٹلوں میں' دکانوں میں' قہوہ خانوں میں' سڑکوں پر' باغات میں' غرض کوئی جگہ ان سے خالی نہ تھی۔ شروع شرو میں تو میں نازی سپاہیوں کو دیکھ کر بہت گھبرایا کرتی مگر آہستہ آہستہ میری وحشت دو ہوتی چلی گئی۔

ایک رات کا ذکر ہے میں ایک قہوہ خانے میں بیٹھی تھی۔ دروازے پر ایک جرمن کرنل نمودار ہوا۔ اس سے میری سرسری سی سلام دعا تھی۔ دروازے پر رک

اس نے سارے ہال میں نظر دوڑائی اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ مسکراتا میری میز کے پاس آ کھڑا ہوا۔ میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اسے قریب ہی بیٹھنے کی پیشکش کی۔ میرا پرس جس میں میرا پستول تھا ایک دم نیچے فرش پر گرا۔ اس کے گرنے سے بڑی زور کی آواز پیدا ہوئی۔ میرے تو پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں فرش پر جھکی' پرس اٹھایا اور اس کو کھول کر اس میں سے وق کا پرمٹ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا یہ پرمٹ میں نے گستاپو ہیڈ کوارٹر بندوق لینے کے لیے حاصل کیا تھا۔ میں نے وہ پرمٹ اس کے سامنے سے اٹھا کر میں دوبارہ رکھ لیا۔ دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کہا۔ "سناؤ' کیا حال ے۔" اور وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت و تعجب کا اظہار ہوتا ۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی بڑے نازی افسر کی بیوی ہوں۔

اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل کوئی جاسوس عورت ہمارے قے میں آئی ہوئی ہے۔ اس کے کپڑے اور پیراشوٹ ملے ہیں۔ تفتیش شروع ہو ی ہے اور جلد ہی وہ قابو میں آ جائے گی۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "جاسوس عورت پیراشوٹ کے ذریعے ہمارے علاقے ں اتری ہے؟ عجیب بات ہے۔"

اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس نازی رنل سے میں نے اپنے تعلقات بڑھائے اور بعد میں اس سے بہت ہی قیمتی معلومات صل کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر کو بھیجیں۔

اس روز جب میں قہوہ خانے سے واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچی تو ایک ان جانے ف سے بار بار میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ بکرے کی ماں کب ک خیر منائے گی۔ آخر کسی نہ کسی روز تو ان لوگوں کو میرے جاسوس ہونے کا پتہ چل جا جائے گا۔ پھر کیا ہو گا؟

ہمارا اسلحہ رات کی تاریکی میں آسمان کی طرف سے آتا۔ ہوائی جہاز جنگلوں میں

مقررہ مقامات پر اسے پھینک جاتے اور پھر ہم منڈی کھلنے کا انتظار کرتے اور اس وقت گھاس پھونس سے لدے ہوئے چھکڑوں میں اس اسلحے کو چھپا کر شہر میں لے آتے۔ نازی فوجیوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ رینگتے ہوئے یہ چھکڑے گھاس پھونس سے نہیں بارود سے بھرے ہیں۔ ہماری خفیہ پارٹی کافی طاقتور ہو چکی تھی۔ پانچ سو فرانسیسی جوان وطنِ عزیز کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہو چکے تھے۔ اور ہمیں معلوم تھا کہ جوش و خروش کا یہ آتش فشاں پہاڑ اگر ایک دفعہ پھٹ گیا تو فرانس کا بچہ بچہ ہمارا ساتھ دے گا۔ ہم نے جرمن فوجوں میں خوف پھیلانا شروع کر دیا۔ ان کے سلسلۂ مواصلات کو درہم برہم کر دیا اور ان کے پٹرول سے بھرے ٹینک آگ کے شعلوں کی شکل میں تبدیل کر دیئے۔ یہاں تک کہ ان کے بجلی کے ڈیزل جنریٹر کو بھی ہم نے خراب کر دیا۔ اس نوعیت کے کاموں میں جان جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا لیکن ہم اب اس سے بے پروا ہو چکے تھے۔ ہمیں دن میں کئی کئی میل پیدل سفر کرنا پڑتا۔

آخر ایک دن ہمیں ہیڈکوارٹر سے پیغام موصول ہوا کہ اتحادیوں کا حملہ جلد ہی ہونے والا ہے اور ہم لوگوں کو تیار رہنا چاہیے۔ آخر ۵ جون ۱۹۴۴ء کو وہ یادگار رات آ ہی گئی۔ اس رات ہم نے اپنی پوری طاقت سے نازیوں پر ضرب لگائی۔ ہم نے لی مانز کی ریلوے لائن اکھاڑ دی' ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے۔ تمام اہم دریائی پل توڑ دیئے اور سڑکوں پر ناکہ بندی کر لی۔ رات کو میں جنگل میں اس طرف جا رہی تھی جہاں ہماری خفیہ مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں' یکایک ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور ساتھ ہی ایک دھیمی آواز آئی۔ ”میں جین ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“

قریباً ایک میل تک ہم جنگل میں چلتے گئے اور آخر ایک محفوظ جگہ کھڑے ہو کر اس نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک نازی آ گئے' انہوں نے ہم کو گھیرے

میں لے لیا' تعداد میں وہ دو سو تھے۔ گھر سے بھاگ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور ان ظالموں نے بغیر کسی تنبیہہ کے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہم نے جواباً" فائرنگ کی اور جیسے ہی راستہ ملا بھاگ نکلے۔ معلوم نہیں کتنے مارے گئے اور کتنے پکڑے گئے۔ وہ ہمارے پیچھے چیختے چلاتے بھاگے آ رہے تھے۔ "اس جاسوس عورت کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔" آخر ہم لوگ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں ہمارے اور کئی ساتھی تھے۔ پال بھی وہیں تھا۔ وہ کہنے لگا ہم کو تو پہلے ہی پتہ چل چکا تھا اور ہم نے تم لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے کچھ آدمی بھی بھیجے تھے۔ کئی اب بھی جنگل میں چھپے تم لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے.........."

طلوعِ آفتاب تک قریباً" اسی آدمی وہاں اکٹھے ہو گئے۔ میں وائرلیس آپریٹر کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی مگر وہ نہ آیا۔ میں نے آنے والے ہر آدمی سے اس کے متعلق پوچھا۔ آخر ایک آدمی نے بتایا۔

"الگزینڈر مارا گیا ہے۔ وہ بالکل میرے پیچھے ہی بیٹھا تھا' جب فائرنگ ہوئی۔ الگزینڈر کے بغیر ہمارا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کیونکہ ہیڈکوارٹر سے وہی مخصوص فری کوئنسی (Frequency) کے ذریعے رابطہ قائم کرتا تھا۔ اب ہمیں گوریلا جنگ پر مجبور ہونا پڑا۔ آخر ہمارے پاس جمع شدہ اسلحہ ختم ہونے لگا۔ ایک دن ہمیں خبر ملی کہ اسلحے سے بھری ہوئی ایک گاڑی لی مانز آ رہی ہے۔ راستہ ہی میں ہم نے ریل کی پٹڑی کے نیچے بم چھپا دیئے اور پھر جب گاڑی آئی' ایک قیامت خیز دھماکے کے ساتھ اس کے ڈبے ہوا میں اچھلے اور زمین پر آ رہے۔ ہم نے جتنا اسلحہ ہو سکا لوٹا اور جنگلوں میں جا چھپے۔ ایک دن کچھ آدمی جنرل پاٹون کی فوج سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جنرل پاٹون نے کہا کہ کسی نہ کسی طرح ہوائی اڈے پر قبضہ کر لو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبار طیارے جنرل پاٹون کی فوج کے لیے ایک مستقل عذاب بنے ہوئے تھے۔

آخر ایک دن تین جہاز ہوائی اڈے پر اترے اور اس سے پیشتر کو دشمن خبردار

ہو سکے' ہمارے فوجی سپاہی ہوائی اڈے پر پھیل گئے ادھر ہماری خفیہ جماعت نے محافظ دستوں کو زبردست فائرنگ کے بعد قریباً" ختم کر دیا۔ اب ہوائی اڈے پر ہمارا قبضہ ہو چکا تھا اور جنرل پاٹون کی فوجیں ہم سے آ ملیں۔ بہت سے نازی افسر قید کر لیے گئے۔ اب مجھے قیدیوں سے پوچھ گچھ کے لیے معمور کیا گیا۔ اور پھر ایک دن میری زندگی کا سب سے حیران کُن حادثہ پیش آیا۔ ایک افسر' جس نے کہ تمام امریکن انٹیلی جنس افسروں کے سامنے بالکل چپ سادھ لی تھی کو میرے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے کاغذات سے میں نے اس کا نام پڑھا۔ یہ وہی کرنل تھا جو مجھ کو قہوہ خانہ میں ملا کرتا تھا۔ وہ گردن اونچی کئے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میری میز کے قریب آ کر اس نے فوجی سلوٹ کیا لیکن جیسے ہی اس کی نظریں میرے چہرے پر پڑیں' حیرت و خوف کے ملے جلے جذبات سے اس کا چہرہ یکدم دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گیا۔

"تم"......... اس نے حیرانگی سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "تم"

میں نے مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا' ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

"تم اور کیا جاننا پسند کرو گی۔ میں تو تم کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہوں۔"

*

پیدائشی چور

اس ہار کی قیمت اتنی زیادہ تو نہ تھی، لیکن چونکہ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا، اس لیے کوئی بھی اونچے درجے کا رئیس یا نواب اسے منہ مانگی قیمت دے کر حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں، اس زمانے میں یہ تاریخی جڑاؤ ہار کونٹس ڈاڈریو سوبیج کے پاس تھا جو اس کے شوہر نے انگلستان کے ایک نامور جوہری جیفریز سے گراں قیمت پر مول لیا تھا۔

آپ پوچھیں گے کہ اس ہار کی تاریخی اہمیت کیا تھی؟ جواب میں اتنا عرض کریں گے کہ اسے فرانس کی شہرۂ آفاق ملکہ میری انتونتی کی خاص فرمائش پر شاہی جوہری بوہمر نے بڑی نفاست سے بنایا تھا۔ فرانس کے خونیں انقلاب کے بعد یہ بیش قیمت ہار مختلف ہاتھوں میں سے ہوتا ہوا آخر کار فروری 1785ء میں کونٹس ڈیلا موت کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک رات اچانک اس کی تجوری میں سے غائب ہو گیا۔ برسوں تک اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا، پھر نصف صدی بعد دفعتہ" اخباروں میں اس ہار کا ذکر دیکھنے میں آیا۔ اٹلی کے ایک جوہری نے اسے فرانس کے ایک نواب ریٹو کے پاس بیچ دیا۔ ریٹو نے مالی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اسے گیسٹن

ڈاڈریو سوبیج کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس وقت سے یہ ہار اسی خاندان کے قبضے میں چلا آتا تھا اور بلاشبہ اس خاندان کے افراد کو اس ہار کے صد سالہ قبضے پر فخر تھا۔ آہستہ آہستہ ڈاڈریو فیملی کے حالات میں تبدیلیاں ہوئیں۔ آمدنی کے ذرائع محدود ہونے لگے۔ مہنگائی بڑھ گئی' اخراجات کم نہ ہو سکے۔ چنانچہ گھر میں صدیوں کا جو قیمتی سامان بھرا ہوا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ فروخت ہونے لگا' حتیٰ کہ تمام نادر اشیاء بک گئیں جن میں سونے کے زیور اور چاندی کے برتن بھی شامل تھے۔ کئی مرتبہ اس خاندان پر کڑا وقت آیا جبکہ ضرورت پوری کرنے کے لیے گھر میں ایک فرانک بھی موجود نہ تھا۔ اس وقت اگر یہ تاریخی ہار بیچ دیا جاتا تو اس کی قیمت اتنی تو مل ہی جاتی جس سے کئی برس اچھی طرح گزر جاتے لیکن ڈاڈریو فیملی کی وضع داری کہئے یا اس ہار سے ان کی محبت کہ انہوں نے اسے پھر بھی فروخت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ واقعہ یہ تھا کہ فرانس کی اعلیٰ سوسائٹی میں محض اس ہار ہی کی وجہ سے کاؤنٹ ڈاڈریو بیج اور اس کی بیوی کی ساکھ قائم تھی۔ اگر ہار کے بک جانے کی خبر ان اونچے حلقے کے لوگوں تک پہنچ جاتی تو شاید ان میاں بیوی کو کوئی منہ لگانا بھی پسند نہ کرتا۔

سال میں دو یا تین موقعے ہی ایسے آتے جب مادام ڈاڈریو اس ہار کو اپنے گلے کی زینت بنا کر امرا اور شرفا کی کسی بڑی تقریب میں شرکت کرتی۔ اسے یہ جان کر کتنی خوشی ہوتی کہ بڑے بڑے عالی دماغ امیروں اور رئیسوں کی بیویاں اس ہار کو کس حسرت بلکہ لالچ بھری نگاہوں سے تکا کرتی ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی ایسا بیش قیمت اور نادر ہار نہ تھا۔ کئی مرتبہ بعض امیر کبیر خواتین نے اشاروں یا دبے الفاظ میں اس ہار کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن ڈاڈریو تو جان سے زیادہ اسے عزیز رکھتے تھے' فروخت کرنے کے ذکر ہی سے ان کا خون کھولنے لگتا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ کاؤنٹ ڈاڈریو نے ایک بڑے بنک کی تجوری محض اس ہار کو رکھنے کے لیے سالانہ کرایے پر لے رکھی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ ہار ہمیشہ بنک کی تجوری میں بند رہتا اور جب کبھی مادام ڈاڈریو کو اس کی ضرورت پڑتی' اس کا شوہر خود بنک جا کر

جوری میں سے ہار نکال کر لاتا اور اگلے روز صبح بنک جا کر اپنے ہاتھوں سے تجوری
میں رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈنمارک کے بادشاہ کے اعزاز میں امرائے فرانس نے ایک شاندار تقریب کا
اہتمام اس محل میں کیا جو اسپین کی ملکہ ازابیلا دوم کی ملکیت تھا۔ ظاہر ہے اس تقریب
میں شرکت کے لیے کاؤنٹ اور اس کی بیوی کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ چنانچہ کاؤنٹ
دوڑا دوڑا بنک گیا۔ تجوری کھول کر ہار نکالا اور گھر واپس آیا۔ اتنے میں مادام تیار ہو
چکی تھیں اور اب صرف ہار کا انتظار تھا۔ جب دونوں میاں بیوی تقریب میں پہنچے تو
سب عورتوں کی نظریں حسبِ معمول اس ہار کا طواف کرنے لگیں جو بے شمار فانوسوں
کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے بیش قیمت بارہ
ہیروں میں سے لاتعداد آتشی زبانیں لہراتی ہوئی نکل رہی تھیں اور ان کی چکا چوند اتنی
تھی کہ زیادہ دیر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس میں کیا شک کہ مادام سوبج خود ایک حسین و
جمیل عورت تھی لیکن جب وہ یہ ہار پہن لیتی تو واقعی ملکہ نظر آتی تھی۔ امرا کی
بیگمیں اس وقت کس قدر رشک و حسد کا شکار ہوئی ہوں گی' جب انہوں نے دیکھا کہ
شاہِ ڈنمارک کی نگاہیں بار بار مادام پر پڑ رہی ہیں' بلکہ اس نے آگے بڑھ کر مادام کی
مزاج پرسی بھی کی اور ہار کی تعریف میں چند الفاظ کہے۔

یہ تقریب آدھی رات کے بعد ختم ہوئی اور کاؤنٹ اپنی حسین بیوی کے ساتھ
سینٹ جرمین والے مکان پر واپس آیا۔ اپنی بیوی کے حسن و جمال کا وہ پہلے ہی دیوانہ
تھا لیکن اس تقریب میں خاص طور پر جب شاہ ڈنمارک نے ان سے ملاقات پر خوشی کا
اظہار کیا تو کاؤنٹ کا دماغ واقعی عرش سے بھی پرے جا پہنچا۔ مادام بھی خوشی سے
پھولے نہ سماتی تھی اور یہ ہر عورت کی بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے حسن کی تعریف
سن کر خوش ہوتی ہے۔ چنانچہ مادام کا خوش ہونا ایک اعتبار سے بجا بھی تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنی خواب گاہ میں گئی اور قد آدم آئینے کے سامنے جا

کھڑی ہوئی۔ تقریب میں جانے سے پہلے بھی وہ دیر تک اسی آئینے کے آگے کھڑی ہو کر اپنے خدوخال کا جائزہ لے چکی تھی اور اب واپس آکر بھی اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ خدا کی پناہ! ہار نے اس کے حسن و جمال میں کس قدر اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ہار پہنے پہنے ہی سو جائے لیکن بہرحال ہار اتارنا تھا۔ نہایت سرد آہ بھر کر اس نے ہار اتارا اور اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔ کاؤنٹ نے احتیاط سے ہار کو ہر طرف سے دیکھا بھالا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کے ہیرے شمار کیے' پھر سرخ مخمل کا ایک ڈبا اٹھا کر ہار اس میں بند کر دیا۔ اس ڈبے پر بنک کی مہر لگی تھی۔ کاؤنٹ نے یہ ڈبا کپڑوں کی اس الماری میں چھپا دیا جو اس کی مسہری کے پائیں میں ہمیشہ رکھی رہتی تھی۔ اس نے پرانی عادات کے مطابق ڈبے کو کپڑوں کے اندر تہہ میں رکھا اور الماری مقفل کر کے اپنی مسہری پر لیٹ گیا۔

اگلے روز کاؤنٹ نے جلد جلد ناشتہ کیا اور بنک جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ وہ جب تک ہار واپس تجوری میں نہ رکھ دیتا' اسے ایک پل چین نہ آتا تھا۔ روزانہ قہوے کی دو پیالیاں ناشتے میں پیا کرتا' لیکن اس روز عجلت میں اس نے صرف ایک پیالی ہی پی۔ اس کے بعد دوبارہ اپنی خواب گاہ میں گیا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی وہیں بیٹھی ہے اور ایک خادمہ اس کے بال سنوار رہی ہے۔ کاؤنٹ کے قدموں کی آہٹ پا کر مادام نے گردن گھمائی اور کہا۔

"کیا کہیں جانے کا ارادہ کر رہے ہو؟"

"ہاں' میرا خیال ہے اسے رکھ آؤں۔" کاؤنٹ نے اشارے میں جواب دیا۔ اسے سے مراد ہار تھا۔ پھر اس نے کپڑوں کی الماری کھولی چند لمحے تک کپڑے ٹٹولتا رہا' پھر بیوی کی طرف منہ کر کے بولا۔

"کیا تم نے اسے دوبارہ نکالا تھا؟"

"میں نے؟" کونٹس نے حیرت سے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔ "بھلا مجھے کیا ضرورت تھی اسے دوبارہ وہاں سے نکالنے کی؟"

"ممکن ہے دیکھنے کے لیے نکالا ہو۔" کاؤنٹ نے بے اختیار کہا۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ ہار ایک مرتبہ مخمل کے ڈبے میں واپس رکھ دینے کے بعد اسے دوبارہ نہیں نکالا جاتا۔

"کیا کہتے ہو؟" کونٹس نے تیزی سے کہا۔ "میں نے تو الماری کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"اچھا؟" یہ کہہ کر کاؤنٹ پھر الماری میں کپڑے الٹنے پلٹنے لگا۔ کونٹس پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے۔ اتنے میں کاؤنٹ نے مڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہار والا ڈبا میں نے کل رات واپسی میں یہاں رکھا تھا......... اب سمجھ میں نہیں آتا کہاں چلا گیا......... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اسی الماری میں......... یہاں......... ان کپڑوں کی تہہ میں اسے احتیاط سے رکھ دیا تھا........."

کونٹس میں اب صبر کی تاب نہ رہی۔ خادمہ کو پرے دھکیل کر وہ اٹھی اور الماری کے قریب گئی۔ پھر اس نے اچھی طرح ایک ایک کپڑے کو دیکھا بھالا۔ ہر تہہ کھولی' الماری کے تمام خانوں کا غور سے جائزہ لیا' مگر بے سود۔ سرخ مخمل کا ڈبا غائب تھا۔

"کیا تمہیں اچھی طرح یاد ہے کے ڈبا اسی الماری میں رکھا تھا؟" کونٹس نے کانپتی ہوئی آواز میں شوہر سے پوچھا۔ "ممکن ہے کہیں اور رکھ دیا ہو؟"

"ارے نہیں۔ اسی الماری میں رکھا تھا......... اوپر کے خانے میں۔" کاؤنٹ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ اسی الماری میں اسے لا کر رکھا کرتا ہوں۔"

"لیکن آدمی سے کبھی کبھار غلطی ہو ہی جاتی ہے۔" کونٹس نے کہا۔ "تم کل کی تقریب میں بے تحاشا پی گئے تھے۔ شاید نشے کے زیرِ اثر تم نے ڈبا کہیں اور رکھ دیا ہو اور اب کہتے ہو کہ الماری میں رکھا تھا۔"

"ہرگز نہیں........." کاؤنٹ چلایا۔ "میں پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ جہاں تک اس ہار کا تعلق ہے' میں کبھی اسے ادھرادھر نہیں پھینکا کرتا۔ یہ بات تم خود جانتی ہو کہ اگر ہم لوگ ایسی ہی بے پروائی سے کام لیتے تو آج یہ ہار ہمارے خاندان میں نہ ہوتا۔ بہرحال میں پھر کہوں گا کہ ہار والا ڈبا میں نے اسی الماری کے اندر رکھا تھا۔ کہو تو قسم کھا لوں۔"

"پھر سوال یہ ہے کہ گیا کہاں؟" کونٹس نے از حد تعجب سے الماری کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "آخر اچھا خاصا بڑا ڈبا ہے۔ کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ........." اس نے ایک ایک کر کے تمام کپڑے الماری سے نکال کر کمرے کے فرش پر ڈھیر کر دیئے۔ پھر دونوں نے الماری کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا' لیکن ڈبے کا کہیں پتہ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

تلاشی کی اس بار بار مشقت سے تھک کر دونوں میاں بیوی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور تشویش بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ڈبے کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ چونکہ وہ اس گئی گزری حالت میں بھی طبقہ امراء میں گنے جاتے تھے۔ اس لیے رونا دھونا اور گلے شکوے فضول جان کر انہوں نے ایک ملازم کو تھانے کی طرف دوڑایا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے کا انچارج ایم ویلورب موقعے پر پہنچ گیا۔ ایم ویلورب نہایت تجربے کار اور دانا آدمی تھا۔ ساری زندگی پولیس میں گزر گئی تھی اور بڑے بڑے پیچیدہ کیس حل کر چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے سب حالات سنے پھر سوالات کا یوں آغاز کیا۔

"موسیو' کیا آپ کو یقین کامل ہے کہ گزشتہ رات کوئی اجنبی آپ کی خواب گاہ میں داخل نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے اس وقت جبکہ آپ گہری نیند میں تھے؟"

"جی نہیں' میری خواب گاہ میں کوئی نہیں آیا۔" کاؤنٹ نے جواب دیا۔ "اس کا مجھے یقین کامل ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں کم از کم دو دلیلیں بھی میرے پاس ہیں۔ پہلی دلیل یہ کہ میں نیند کا بہت ہلکا ہوں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی نہیں اور میری

آنکھ جھٹ سے کھلی نہیں۔ بلی بھی دبے پاؤں میرے قریب سے گزرے تو میں اٹھ جاتا ہوں۔ دوسری دلیل زیادہ وزنی ہے اور وہ یہ کہ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ صبح جب خادمہ نے آن کر دروازے پر دستک دی تب میں نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔"

"ہوں......... ہوں........." پولیس افسر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر ممکن ہے کوئی اور راستہ آپ کی اس الماری تک پہنچنے کا چور کو مل گیا ہو؟"

"ناممکن ہے جناب۔" کاؤنٹ نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"آہا......... میں دیکھتا ہوں کہ ایک کھڑکی بھی اس کمرے میں ہے........."

"لیکن جناب کھڑکی بھی اندر سے بند تھی۔"

"بہرحال......... بہرحال......... میں ذرا ایک نظر اس کھڑکی کو دیکھنا چاہوں گا۔"

"ضرور دیکھئے۔" کاؤنٹ نے کہا اور پولیس افسر کے ساتھ اٹھ کر کھڑکی کے نزدیک آیا۔ معلوم ہوا کہ آدھی کھڑکی ایک دوسری الماری نے روک رکھی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کھڑکی کھولنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے الماری ہٹائے' لیکن الماری بغیر آواز دیئے اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کر سکتی تھی۔

"ادھر سے کسی کا کمرے میں آنا محال ہے۔" کاؤنٹ نے کہا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے موسیو' لیکن یہ تو بتائیے کہ کھڑکی کے پرلی طرف کیا ہے؟"

"پرلی طرف؟ ایک چھوٹا سا اندرونی صحن ہے اور کچھ نہیں۔"

"اس صحن کے اوپر مکان کی کتنی منزلیں ہیں؟"

"صرف دو منزلیں......... لیکن جس منزل پر ہمارے گھر میں کام کاج کرنے والے ملازم رہتے ہیں' وہاں اس صحن کے اوپر ایک تنگ جھروکہ ہے جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔"

"اگر زحمت نہ ہو تو ذرا یہ دوسری الماری ہٹوایئے۔" پولیس افسر نے کہا۔
الماری ہٹائی گئی۔ پتا چلا کہ واقعی کھڑکی اندر سے بند ہے۔ اگر کوئی شخص پرلی طرف سے کمرے میں آتا تو کھڑکی ضرور کھلی ہوتی۔ یکایک پولیس افسر نے کہا۔
"مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ چور اس کھڑکی کے راستے اندر آیا۔ اندر آن کر اس نے کھڑکی بند کر دی۔ کپڑوں کی الماری سے ہار کا ڈبا نکالا اور دروازے کی راہ سے نکل گیا۔"

"جناب' آپ بھول گئے۔" کاؤنٹ کے لہجے میں اس مرتبہ حد درجہ حقارت تھی۔ "میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ صبح جب خادمہ آئی تب میں نے خود اٹھ کر کھولا تھا۔"
"آہ ! بے شک میں بھول گیا۔" ایم ویلورب، نے پیشانی سے ندامت کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے گردن جھکا کر کچھ سوچنے کے بعد اس نے کونٹس کی طرف دیکھا اور کہا۔
"محترمہ' کیا گھر کے نوکروں کو معلوم تھا کہ آپ کل شب ایک تقریب میں جانے کے لیے یہ قیمتی ہار اپنے گلے کی زینت بنائیں گی؟"
"جی ہاں' سبھی نوکروں کو یہ بات معلوم تھی اور ہمیشہ سے معلوم ہوتی ہے۔" کونٹس نے بتایا۔ "ہم اپنے گھر کی کوئی بات نوکروں سے چھپا کر نہیں رکھتے۔ نوکر سب اعتبار کے قابل اور بھروسے کے ہیں۔ ویسے یہ کسی کو پتا نہ تھا کہ میرا شوہر ہار کا ڈبا کپڑوں کی الماری میں رکھا کرتا ہے۔ یہ بات نوکروں کو بتانے کی نہ تھی.........."
"کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ ہار کے الماری میں رکھے جانے کی خبر کسی کو نہ تھی؟" پولیس افسر نے لفظ "کسی" پر خاص زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "بہتر یہ ہو گا کہ آپ خوب سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دیں اور براہِ کرم کچھ چھپانے کی کوشش نہ فرمایئے۔ اگر آپ مجھ سے کچھ چھپانا چاہیں گی تو میں اس تفتیش میں حصہ لینے سے معذور ہوں۔"

کوئنٹس نے کچھ نادم ہو کر' کچھ ہچکچا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"میرا خیال مسز ہنریت کی طرف گیا تھا......... لیکن اب سوچتی ہوں اس عورت کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس کے بارے میں کبھی ایسی ویسی بات سننے میں تو نہیں آئی؟"

"مسز ہنریت کا اس قصے سے کیا تعلق۔" کاؤنٹ نے تسلیم کیا۔

"میں پوچھتا ہوں یہ مسز ہنریت ہے کون؟" ایم ویلورب نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ارے صاحب' میری ایک پرانی واقف کار ہے۔" کوئنٹس نے کہنا شروع کیا۔ عورت بہت شریف اور نیک اطوار کی ہے۔ اس نے نہ جانے کیوں ایک مفلس اور غریب آدمی سے شادی کر لی تھی۔ جب اس کا خاوند دوسری دنیا کو سدھار گیا تو بے آسرا ہو گئی۔ ایک لڑکا بھی اس کے ہاں ہو چکا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے اور اس کے بچے کو اپنے ہاں بلا لیا۔ دو فالتو کمرے اسے رہنے کو دے دیئے۔ کچھ گھر کا کام کاج بھی وہ کر دیا کرتی ہے۔"

"وہ کمرے کس منزل پر ہیں؟"

"اسی منزل میں ہیں جناب......... دراصل اس کے ایک کمرے کی کھڑکی اس صحن کی جانب کھلتی ہے۔"

"اور وہ کھڑکی میری اس خواب گاہ کی کھڑکی کے بالکل سامنے ہے۔" کاؤنٹ نے ایک دم کہا۔ "مگر میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس بیچاری عورت کا اس معاملے میں کچھ سروکار نہیں ہو گا۔"

"میں ذرا اس خاتون سے ملنا چاہتا ہوں۔" ایم ویلورب نے کہا۔

تینوں آدمیوں کا یہ قافلہ مسز ہنریت کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ بیٹھی کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ قریب ہی اس کا چھ سات برس کا لڑکا ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ لڑکے کو راول کہتے تھے۔ کاؤنٹ اور کوئنٹس کو پولیس افسر کے ساتھ آتے دیکھ کر

بے چاری عورت ہکا بکا رہ گئی اور جب اسے بتایا گیا کہ کونٹس کا نادر روزگار ہار گم ہو گیا ہے تو صدمے سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد ہی ایم ویلورب کی معلومات میں اتنا اضافہ ہوا کہ گزشتہ شب کونٹس کے کپڑے مسز ہنریت ہی نے بدلوائے تھے اور وہ ہار بھی اسی نے کونٹس کے گلے میں باندھا تھا' لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ کونٹس جب بھی کسی اہم تقریب پر باہر جاتی تو لباس بدلوانا اور ہار گلے میں باندھنے کا فرض مسز ہنریت ہی کو سرانجام دینا پڑتا تھا۔

پولیس افسر نے چند لمحے گہری نظروں سے مسز ہنریت کا جائزہ لیا پھر کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"ہار کی چوری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ مسز ہنریت؟"

"بہت افسوسناک واردات ہے جناب والا۔" عورت نے پریشان ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے ایسا حادثہ اس گھرانے میں اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔"

"میں پوچھتا ہوں تمہاری دانست میں یہ واردات کس نے اور کیسے کی ہو گی؟"

عورت نے تعجب کی نگاہوں سے ایم ویلورب کو دیکھا اور ہکلا کر بولی۔

"میں........ میں کیا عرض کر سکتی ہوں........ یہ جاننا تو پولیس کا کام ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ چور تمہارے کمرے میں سے ہو کر کاؤنٹ کی خواب گاہ میں گیا ہو؟"

"آپ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ممکن ہے میں ہی کاؤنٹ کے کمرے میں جا کر ہار چرا لائی ہوں۔" مسز ہنریت نے سنجیدگی سے کہا۔ "جناب' گھما پھرا کر بات کرنے سے کیا فائدہ؟ سیدھا سیدھا مجھ پر الزام لگا دیجئے چوری کا۔"

"ارے........ نہیں نہیں........ مسز ہنریت........ میرا یہ مطلب........"

پولیس افسر نے گھبرا کر کہنا شروع کیا۔

"میں آپ کا مطلب خوب سمجھتی ہوں جناب، کوئی دودھ پیتی بچی تو ہوں نہیں........ بہرحال اگر ایک لمحے کے لیے مان لیا جائے کہ آپ کا مطلب وہ نہیں تو

ب بھی آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں روز و شب کے چوبیس گھنٹے انہی کمروں میں گزارتی ہوں اور کبھی مالکوں کی لاعلمی میں گھر سے باہر نہیں گئی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مسز ہنریت نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی اور اشارے سے بتایا۔ "خود دیکھ لیجئے یہاں سے کاؤنٹ کے کمرے کی کھڑکی تک کوئی نو دس فٹ کا فاصلہ ہے......... اور یہاں سے کاؤنٹ کی خواب گاہ تک بے آواز جانا اور کپڑوں کی الماری میں سے ہار کا ڈبا اڑا لینا کسی انسان کا نہیں جن کا کارنامہ نظر آتا ہے۔"

ایم ویلورب نے چونک کر مسز ہنریت کو دیکھا اور جلدی سے بولا۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہار کا ڈبا کپڑوں کی الماری میں رکھا ہے؟"

ایک خفیف سی مسکراہٹ عورت کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"جناب، مجھے معلوم تھا کہ موسیو ڈاڈریو ہمیشہ اس ڈبے کو اسی الماری میں رکھا کرتے ہیں۔ خود ایک دو مرتبہ کونٹس نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ یقین نہ آئے تو پوچھ لیجئے یہ موجود ہیں۔"

کونٹس نے اثبات میں گردن ہلائی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسز ہنریت سچ کہہ رہی ہے۔

کاؤنٹ کے کمرے میں واپس آنے کے بعد ایم ویلورب نے خود کہا۔

"مجھے کوئی شبہہ اس عورت پر نہیں ہے۔ شرافت اس کے چہرے سے ٹپکتی ہے اور میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ جب اس نے ہار گم ہونے کی خبر سنی، تو صدمے اور رنج کے جو آثار اس کی آنکھوں میں نمودار ہوئے، وہ حقیقی تھے۔ ان میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہ تھی۔"

"جی ہاں، وہ نہایت دیانتدار اور نیک عورت ہے۔ اتنے عرصے سے وہ ہمارے گھر میں اپنے لڑکے سمیت رہ رہی ہے اور ہم نے اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں دیکھی۔"

مسز ہنریت سے فارغ ہو کر گھر کی دوسری خادماؤں اور ملازموں کی باری آئی۔

سب پر خوب جرح کی گئی' مگر کوئی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یوں بھی تمام نوکر بھروسے کے لائق اور مدتوں پرانے تھے۔ اس کے بعد پھر الماری کی شامت آئی۔ پولیس افسر نے بار بار اسے کھولا' بند کیا' ایک ایک جوڑ' ایک ایک خانے اور تختے کا معائینہ کیا لیکن اس میں کوئی خفیہ جگہ ایسی نہ تھی جہاں ڈبا چھپایا جا سکے۔ دراصل خواب گاہ کی کھڑکی کا اندر سے بند ملنا اس بات کا فیصلہ کن ثبوت تھا کہ چور اس کمرے میں آیا ہی نہیں۔ پھر سوال یہ تھا کہ ہار کا ڈبا آخر گیا کہاں؟

☆ ☆ ☆

کئی روز کی لاحاصل مغزپاشی کے باوجود معاملہ جوں کا توں رہا۔ ہر پھر کر بات دوبارہ مسز ہنریت ہی پر آن ٹھہرتی تھی۔ اس کے خلاف بظاہر دو باتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ اسے پتہ تھا کہ ہار گھر میں موجود ہے' دوسری بات یہ کہ ہار کپڑوں کی الماری میں رکھا ہے۔ چنانچہ ایم ویلورب نے چپکے ہی چپکے اس کے حالات کی چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ عورت واقعی شریف ہے اور اس کے چال چلن کے بارے میں کبھی ایسی ویسی خبر سننے میں نہیں آئی۔

وہ گزشتہ تین برس سے کاؤنٹ ڈاڈریو کے مکان میں رہ رہی ہے اور اس طویل مدت میں وہ صرف چار مرتبہ مکان سے باہر گئی۔ ایک مرتبہ درزی کے ہاں کوئی کپڑا سلوانے' دوسری مرتبہ اپنے بیمار بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے' تیسری مرتبہ اپنا ایک زیور فروخت کرنے کے لیے صرافہ بازار اور چوتھی مرتبہ اپنے لڑکے راول کو قریبی سکول میں داخل کرانے........ ایم ویلورب کو نہ جانے اب کیوں یہ شبہ تھا کہ اس عورت نے اگرچہ خود جرم نہیں کیا' مگر وہ مجرم کی شریک کار ضرور ہے۔ تاہم اسے ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس نے پولیس چیف کو ان تمام واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ اگر مسز ہنریت کو گرفتار کرلیا جائے تو ممکن ہے دہشت زدہ ہو کر وہ تمام راز اگل دے۔اس کے جواب میں پولیس چیف نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

"موسیو ویلورب، معلوم ہوتا ہے تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ فرض کرلو وہی عورت مجرم ہے اور یہ بھی فرض کرلو کہ ہم نے اسے گرفتار کرلیا، تب بھی عدالت کے کمرے میں وکیل صفائی کے اس واضح اعتراض کا جواب کون دے گا کہ آخر وہ کاؤنٹ کی خواب گاہ میں داخل کیوں کر ہوئی جبکہ کھڑکی اور دروازہ دونوں اندر سے بند تھے؟ ایک لمحے کے لیے ہم یہ بھی فرض کیے لیتے ہیں کہ چور باہر سے آیا پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کمرے سے نکلا کیونکر؟ کس راستے سے؟ نہیں موسیو، میرے خیال میں بات ہی کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟" ایم ویلورب نے پوچھا۔

"ہار چوری ووری کچھ نہیں ہوا۔ کاؤنٹ ڈاڈریو اور اس کی بیوی کے مالی حالات آج کل دگرگوں ہیں۔ اس حقیقت کا مجھے علم ہے۔ اگر وہ کھلے بندوں ہار فروخت کرتے تو اس میں ان کی بدنامی تھی اور شرفا کے طبقوں میں ساکھ گرنے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے چوری چھپے ہار کہیں بیچ ڈالا اور ہمیں بیوقوف بنانے کے لیے ڈکیتی کا یہ قصہ تصنیف کرلیا۔ اس قصے کو داخل دفتر کرو اور کاؤنٹ سے کہہ دو کہ پولیس اس معاملے کو سلجھانے سے سرِدست معذور ہے۔"

ممکن ہے پولیس چیف کا یہ خیال درست ہو، تاہم اونچے حلقوں میں جب ہار کے گم ہونے کی خبر اڑی، تو چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ ان میں حاسد زیادہ تھے اور حاسدوں میں خواتین کی اکثریت جنہیں اس نادر روزگار ہار کا کونٹس ڈاڈریو کے قبضے میں دیکھنا کسی صورت گوارا نہ تھا۔ دل ہی دل میں وہ بے حد خوش تھیں لیکن رسمی دکھاوے کو انہوں نے کاؤنٹ کے گھر آ آکر اس انداز میں اظہار افسوس کیا جس میں مضحکہ اور طنز زیادہ شامل تھا۔ یہ جو کچھ ہوا، بہرحال ڈاڈریو فیملی کے لیے قابلِ برداشت تھا مگر آگے چل کر ہار کی گمشدگی ان کے لیے بلائے جان ہو گئی۔ جن ساہو کاروں سے کاؤنٹ اور اس کی بیوی نے بڑی بڑی رقمیں محض ہار کی ساکھ پر قرض لے رکھی تھیں۔ اب انہوں نے تقاضے کر کر کے

ناک میں دم کر دیا۔ کاؤنٹ کا بازار میں نکلنا حرام ہو گیا' انگلیاں اٹھتیں' لوگ آوازے کستے' رفتہ رفتہ اونچی سوسائٹی میں جو رہا سہا مرتبہ اور وقار تھا وہ بھی جاتا رہا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق کاؤنٹ اور کونٹس سے اور کچھ تو نہ ہو سکا بے چاری مسز ہنریت پر سارا بخار اتارا اور اسے ایک دن کے نوٹس پر اپنے مکان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

مسز ہنریت کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں اس مکان سے رخصت ہوئی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔ کئی ماہ بعد اچانک کونٹس کے نام مسز ہنریت کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا۔

"مادام' امید ہے آپ اور آپ کے شوہر ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ نے جو تحفہ ارسال کیا ہے وہ مجھے مل گیا بے حد شکر گزار ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کے سوا اس دنیا میں اور کون ہے جو مجھ پر ترس کھا کر یہ مہربانی کرے گا۔ یوں بھی میرا پتہ کسی اور کو معلوم نہیں۔ آپ کے بڑے احسانات مجھ پر ہیں اور میں اکثر آپ کو یاد کرتی ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو اس کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔

بد نصیب

مسز ہنریت

کونٹس نے بار بار یہ خط پڑھا اور دیر تک عالم حیرت میں گم رہی۔ اس نے تو کوئی چیز مسز ہنریت کو نہ بھیجی تھی' پھر یہ کیا قصہ تھا؟ آخر فیصلہ ہوا کہ مسز ہنریت کو خط لکھ کر معلوم کیا جائے۔ وہاں سے فوراً" جواب آیا کہ ایک ایک ہزار فرانک کے دو نوٹ عام لفافے میں بند ملے تھے۔ مسز ہنریت نے وہ لفافہ بھی اپنے خط میں رکھ کر کونٹس کو بھیج دیا۔ لفافے پر پیرس کے ڈاک خانے کی مہر اور شکستہ خط میں مسز ہنریت کا پتہ درج تھا۔ اس معمے نے ایک بار پھر کاؤنٹ اور اس کی بیوی کو پریشان کر دیا۔

سوال یہ تھا کہ آخر دو ہزار فرانک کی گراں قدر رقم کس نے اور کیوں مسز
ہنریت کو بھیجی۔ کاؤنٹ ووڑا ووڑا پھر ایم ویلورب کے پاس گیا۔ اس نے لفافے کو
الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پیرس کے جس ڈاک خانے کی مہر تھی' وہاں جا کر پوچھ گچھ کی مگر
کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ ڈاک خانے والوں نے کہا کہ اگر یہ لفافہ رجسٹری کر کے بھیجا
جاتا تو شاید بھیجنے والے کا آتا پتا ہمارے پاس محفوظ ہوتا لیکن اس قسم کے عام لفافے
ہزاروں کی تعداد میں روزانہ ڈاک میں آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ یہ دیکھنا ڈاک
خانے والوں کے فرائض میں شامل نہیں کہ لوگ لفافوں کے اندر کیا رکھ کر بھیجتے ہیں'
خط یا کرنسی نوٹ' بہرحال یہ انہوں نے تسلیم کیا کہ اس طرح رقم بھیجنا ہے خلافِ
قانون اور قاعدہ۔غرض بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک سال گزر گیا۔ دوسرے سال کے شروع میں مسز ہنریت کا خط پھر کونٹس
کے نام آیا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آپ نے مجھ غریب بے آسرا کو پھر دو ہزار
فرانک کے نوٹ لفافے میں رکھ کر ارسال کئے ہیں۔ اگرچہ آپ نے اپنا نام ظاہر نہیں
کیا مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کرم آپ ہی کی جانب سے ہوا ہے۔ میں از حد شکر گزار
ہوں۔ اس رقم سے میرا وقت اچھا گزر جائے گا۔ دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی
ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کونٹس اور کاؤنٹ نے یہ خط پڑھا اور بے ہودہ مذاق سمجھ کر ایک
طرف پھینک دیا۔

تیسرے سال کے آغاز میں پھر مسز ہنریت کی جانب سے شکریے کا خط آیا اور
دو ہزار فرانک کے نوٹ لفافے میں سے برآمد ہونے کی اطلاع۔ چوتھے برس
بھی...... پانچویں اور چھٹے برس اطلاع آئی کہ مادام اب تو آپ نے احسانوں کی انتہا
کر دی۔ پہلے مجھے ہر سال دو ہزار فرانک بھیجا کرتی تھیں اس مرتبہ چار ہزار فرانک
بھیجے ہیں۔ تعجب کی بات یہ کہ پانچویں اور چھٹے برس دونوں لفافے عام خط کے بجائے
رجسٹری کرا کے بھیجے گئے تھے۔ ایک پر سینٹ جرمن کے اور دوسرے پر سورون کے
ڈاک خانے کی مہر تھی۔ بھیجنے والے نے اپنا نام پانچویں لفافے پر اینکتے اور چھٹے لفافے

پر بسمارڈ لکھا تھا۔ پولیس نے سرگرمی سے تفتیش شروع کی مگر پتہ چلا کہ دونوں نام فرضی ہیں۔ مسز ہنریت سے بھی پوچھ گچھ کی گئی کہ اس کے خیال میں کونٹس ڈاڈریو کے علاوہ اور کون ایسا فرد ہے جو باقاعدگی سے ہر سال اتنی بڑی بڑی رقمیں اسے ارسال کر سکتا ہے مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی اور معاملے پر اسرار کا دبیز پردہ پڑا رہا۔ ساتویں برس مسز ہنریت کا چند روز کی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ہر سال کسی نہ کسی بہانے اخباروں میں کونٹس کے تاریخی ہار کا ذکر ضرور ہوتا اور پولیس پر لعن طعن کہ ہار اب تک برآمد نہیں ہوا۔ بعض رپورٹروں نے اس سلسلے میں لمبے لمبے مضمون لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ڈاڈریو فیملی نے یہ ہار قطعاً" فروخت نہیں کیا۔ اگر اسے بیچا گیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ چھ برس کے اس طویل عرصے میں یہ مسلسل چھپا رہتا۔ اسے کہیں نہ کہیں دیکھا ضروری جانا چاہیے تھا۔ بلاشبہ اس دلیل میں وزن تھا' اس لیے آہستہ آہستہ ڈاڈریو میاں بیوی کی ساکھ پھر اونچے حلقوں میں بحال ہونے لگی اور سب کو یقین آتا چلا گیا کہ واقعی یہ ہار چوری ہوا ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں کاؤنٹ کے بعض دور پرے کے ایک دو رشتے داروں کا انتقال بھی ہوا تھا' جن کی جائیداد اور کچھ نقد رقم وارثت کے حصوں میں سے کاؤنٹ کو ملی تھی اور یوں ان کے دن پھر گئے تھے۔

اب پھر پارٹیوں اور تقریبوں کی سوجھی' چنانچہ ایک شب کاؤنٹ نے اپنے گھر پر خاص دعوت کا اہتمام کیا جس میں دس پندرہ مرد اور اتنی ہی خواتین امرا کے طبقے کی شامل ہوئیں۔ یہ سب کے سب افراد کاؤنٹ کے پرانے دوست تھے۔ ان میں فوج کے جنرل مارکوئیس زیرز' پیرس کلب کے صدر موسیو ڈیزاولی' ڈپٹی مجسٹریٹ ایم بوکاس اور ایک چست چالاک نیلی آنکھوں والا نوجوان فلوریانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فلوریانی سے کاؤنٹ کی ملاقات حال ہی میں ہوئی تھی اور وہ اس نوجوان کی ذہانت و فطانت اور خوش اخلاقی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ فلوریانی کے بارے میں اسے صرف

اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اٹلی کا رہنے والا ہے۔ مختلف علوم و فنون میں اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں اور اپنی پُر کشش شخصیت اور مسحور کُن اندازِ گفتگو کے باعث اسے ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ خواتین تو اس کی بڑی مداح تھیں۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا اور مزے مزے کی باتیں ہونے لگیں۔ خواتین اس دوران میں دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی مردوں نے ان کی کمی محسوس کی، لیکن خواتین نے اس شرط پر مردوں کو وہاں آنے کی اجازت دی کہ ہر شخص کوئی دلچسپ قصّہ یا آپ بیتی بیان کرے۔ یہ شرط مان لی گئی اور سب سے پہلے جنرل مارکوئیس نے اپنی زندگی کا ایک ہولناک واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ ایک بد روح کے بارے میں تھا۔ جو صدیوں پرانے ایک قلعے میں رہتی تھی اور جنرل صاحب کو اپنی کسی فوجی مہم کے دوران میں ایک شب اس قلعے میں کاٹنی پڑی تھی۔ سب نے بے حد شوق اور توجہ سے یہ داستان سنی۔ اس کے بعد نوجوان فلوریانی نے ایک گمشدہ انگوٹھی کا قصہ سنایا جو اس کے والد کی ملکیت تھی اور جس میں ایک نایاب الماس جڑا ہوا تھا۔ پولیس اس انگوٹھی کو تلاش کرنے سے جب عاجز آگئی تو آخر کار فلوریانی نے حیرت انگیز طریق پر چور کا سراغ لگایا۔ یہ کہانی بھی بڑی دلچسپی سے سنی گئی۔

اس کے بعد باری تھی ایم بوکاس کی، لیکن اس نے نہایت چالاکی سے پہلو بچاتے ہوئے ایک دم کاؤنٹ کے گمشدہ ہار کا ذکر چھیڑ دیا اور پھر ہر فرد نے اس کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار شروع کیا، مگر کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہو سکا، یعنی یہ راز نہ کھلا کہ چور آیا کہاں سے اور گیا کہاں سے؟ اس سرگرم بحث میں سبھی شریک تھے سوائے فلوریانی کے۔ وہ اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا اطمینان سے پائپ پی رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ یکایک کونٹس نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

"موسیو فلوریانی، آپ چپ ہیں! بھلا اس معاملے میں آپ کی ذہانت کیا کہتی ہے؟"

سب نے قہقہہ لگایا۔ فلوریانی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"مادام' میں کیا اور میرے رائے کیا؟ بہرحال آپ سب کی گفتگو میں نے دلچسپی سے سنی۔"

"دیکھئے ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے۔" ایم بوکاس نے کہا۔ "آخر کچھ نہ کچھ تو رائے آپ کی ہوگی۔"

"ہاں ہاں' کھل کر بات کیجئے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔" جنرل صاحب نے کہا۔

"آپ حضرات خوامخواہ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔" فلوریانی نے انکساری سے کہنا شروع کیا۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ اپنا ایک واقعہ سنانے کے بعد مجھے کونٹس کے قیمتی ہار کے بارے میں بھی اپنی رائے دینی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض حالات میں مجھ جیسا کم عقل اور ناتجربے کار شخص بھی اچانک اس راز کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے' جہاں ماہرین فن کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی......... یقیناً" میں نے اپنے خاص استدلال اور سوچ بچار کے ذریعے مختلف پیچیدہ معمے حل کئے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے شرلک ہومز ہونے کا دعویٰ نہیں......... یوں بھی میں شروع سے آخر تک اس ہار کے بارے میں تمام تفصیلی اور جزئی واقعات سے بے خبر ہوں۔ اگر کاؤنٹ ڈاڈریو مہربانی فرما کر سارا حال بیان فرمائیں تو شاید میں کچھ عرض کر سکوں۔"

کاؤنٹ کو اگرچہ ہار کے بار بار ذکر سے سخت ذہنی اذیت ہوتی تھی اور وہ اس دلچسپ محفل میں یہ ناگوار ذکر چھیڑ کر اپنی اور دوسروں کی کوفت کا باعث بننا نہ چاہتا تھا لیکن حاضرین کا اصرار دیکھ کر اس نے الف سے یے تک ساری داستان سنا ڈالی۔ اس دوران میں فلوریانی آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت اپنی نشست پر جما رہا۔ اس نے پائپ کا کش بھی نہ لیا' ہاں' ایک دو موقعوں پر اس نے قطع کلام کر کے چند سوالات کاؤنٹ سے کیے اور ان کا جواب پا کر معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ جب داستان تمام ہوئی تو تحیر کی ایک فضا نے حاضرین کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"کوئی شک نہیں کہ یہ واردات عجیب و غریب ہے۔" فلوریانی نے آہستہ سے

کہا۔ "لیکن میری ناقص رائے میں اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔"

یہ سنتے ہی سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ خواتین نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کوئنٹس نے جھک کر فلوریانی سے کہا۔ "خدا کی پناہ' کیا واقعی میرے گمشدہ ہار کا سراغ لگایا جا سکتا ہے؟"

"ہاں مادام' میرا خیال کچھ ایسا ہی ہے۔ اب کاؤنٹ کی زبانی پورے واقعات سننے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ تو بہت آسان تھا۔"

"آسان؟" کاؤنٹ نے اپنے پرانے تحقیر آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بہت آسان۔" فلوریانی نے بجھا ہوا پائپ دوبارہ جلاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ یوں کہ جو فرد بھی آپ کا ہار چرانے کے ارادے سے آیا' اس کے سامنے دو ہی راستے اندر آنے کے تھے۔ دروازہ یا کھڑکی؟"

"مگر آپ بھول رہے ہیں کہ دروازہ اور کھڑکی دونوں اندر سے بند تھے۔" کاؤنٹ نے اعتراض کیا۔

"بے شک دونوں اندر سے بند تھے۔" فلوریانی نے کہا۔ "میرے خیال میں بند دروازہ باہر سے کھولنا ممکن نہ تھا' اس لیے چور بہرحال کھڑکی کی راہ سے آپ کی خواب گاہ میں آیا۔"

"پھر وہ انسان کے بجائے کوئی بھوت ہو گا جو بند کھڑکی میں سے گزر آیا۔" جنرل نے ایک دم قہقہہ لگا کر کہا۔ "موسیو' آپ کی یہ بات اپنی کھوپڑی میں آئی نہیں۔"

"جناب! اگر آپ ذرا غور کرنے کی زحمت اپنی کھوپڑی کو عطا فرمائیں تو بات "ذرا" سمجھ میں آ جائے گی۔" فلوریانی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "چور کا کام صرف کھڑکی تک پہنچنے کا تھا اور یہ کام اس نے یوں سرانجام دیا کہ بانس کی سیڑھی یا کوئی چوبی تختہ سامنے والی کھڑکی کے باہر نکلے ہوئے چھجے تک رکھ دیا۔ بعد ازاں وہ اس سیڑھی یا تختے پر آسانی سے چلتا ہُوا صحن عبور کر کے کاؤنٹ کی کھڑکی تک آن پہنچا۔"

"چلیئے مان لیا، مگر یہ الجھن پھر بھی باقی رہتی ہے کہ وہ بند کھڑکی میں سے اندر کیوں کر گیا اور دلچسپ بات یہ کہ کھڑکی صبح کو بند پائی گئی؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

فلوریانی نے پائپ کا کش لگایا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"میں مانتا ہوں کہ کھڑکی صبح کو بند پائی گئی، مگر یہ بات تو کاؤنٹ ڈاڈریو بتائیں گے کہ کیا اس کھڑکی کے اندر ایک گھومنے والا لکڑی کا چھوٹا سا ٹکڑا نہیں لگا ہے، جس کے ذریعے یہ کھڑکی کھولی اور بند کی جا سکتی ہے؟"

کاؤنٹ کے ہونٹوں میں دبا ہُوا سگار ایک دم نیچے گر گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور وہ پلک جھپکائے بغیر فلوریانی کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے چونک کر حاضرین سے معافی طلب کی، اپنا سگار فرش پر سے اٹھایا اور آہستہ سے بولا۔

"مگر........ میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر آپ نے کیوں کر جان لیا کہ اس کھڑکی میں اس قسم کا لکڑی کا کوئی ٹکڑا کھولنے بند کرنے کے لیے اندر کے رخ لگا ہوا ہے؟"

"بہت آسان یہ ہے یہ تو........" فلوریانی نے مسکرا کر کہا۔ "جس زمانے کا یہ مکان ہے، اس زمانے کے اکثر مکانوں کی کھڑکیوں میں اندر کی طرف لکڑی کے ایسے گھومنے والے ٹکڑے لگائے جاتے تھے۔ اگر یہ ٹکڑا اس کھڑکی میں نہیں ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ واردات ناقابلِ حل ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" کاؤنٹ نے جلدی سے کہا۔ "میری خواب گاہ کی کھڑکی میں گھومنے والا لکڑی کا چھوٹا سا ٹکڑا اندر کے رخ لگا ہے لیکن حیرت ہے کہ اگر چور اسے کھول کر اندر آیا تو پھر کھڑکی بند کس نے کی؟"

"اسی نے بند کی جس نے اسے کھولا۔" فلوریانی نے کہا۔ "معاف فرمائیے، آپ کی اور پولیس والوں کی سخت غلطی تھی کہ لکڑی کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو نظرانداز کر دیا۔ اگر آپ اسی وقت اس کا معائنہ کرتے تو پتا چل جاتا کہ اسے کھولا گیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی کہ ہر فرد اپنے دل کی دھڑکن بخوبی سن سکتا تھا۔ سب کی نگاہیں نوجوان اطالوی فلوریانی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، لیکن وہ انتہائی بے نیازی سے پائپ کے کش پہ کش لگائے جاتا تھا۔ آخر ڈپٹی مجسٹریٹ یم بوکاس نے گردن آگے بڑھا کر مدھم آواز میں کہا۔

"آفرین ہے آپ کی اس سوجھ بوجھ پر، مگر یہ تو بتائیے کہ چور نے کھڑکی کے ندر لگا ہوا وہ لکڑی کا ٹکڑا گھمایا کیسے؟"

"غالباً" لوہے کے اس تار کو کھینچ کر جس کے ذریعے یہ ٹکڑا کھڑکی کو بند کیے وئے تھا۔"

"لیکن ایک شخص باہر کی جانب سے اندر کی طرف اس تار کو کیسے کھینچ سکتا ہے؟" کاؤنٹ نے کہا۔

"یہ کام کچھ بھی دشوار نہیں۔ میرے قیاس کے مطابق آپ کی اس کھڑکی میں ی دروازہ بند کرنے والی لوہے کی اس تار کے نیچے ایک چھلا لٹکا ہوا ہو گا؟"

"بے شک ایسا چھلا اس میں لگا ہے۔"

"اور وہ چھلا کھڑکی اور اس کے قریب رکھی ہوئی الماری کے درمیان لٹکا رہتا ے؟"

"بالکل صحیح ہے۔" کاؤنٹ نے اقرار کیا۔ "لیکن خدا رحم کرے........ میری ھ میں نہیں آتا کہ........"

"چور نے اس چھلے کو کھینچا کیوں کر؟" فلوریانی نے اس کا جملہ مکمل کرتے ئے کہا۔ "یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ؟ اب میں عرض کرتا ہوں، یاد کیجئے کہ ایک یک سی درز لکڑی کے اس گھومنے والے ٹکڑے کے آس پاس موجود ہے۔ چور نے ر کھڑے ہو کر کسی باریک سی تار کا ہک بنایا، اس درز میں داخل کیا، چھلے میں اٹکایا ر اسے کھینچ لیا۔ کھڑکی کھل گئی۔"

"کیا کہنے ہیں آپ کے؟" کاؤنٹ کے لہجے میں طنز کا زہر بھرا ہوا تھا۔ "بے

شک کھڑکی چور سے کھلوانے کا لاجواب طریقہ آپ نے سوچا' مگر میں عرض کرتا ہوں کہ جس طرح کی کوئی باریک سی درز آپ نے فرض کر لی ہے کہ ٹکڑے کے پار موجود ہے' ایسی کوئی درز وہاں نہیں۔"

"کیا واقعی؟" فلوریانی نے مسکرا کر کہا۔ "پہلے میرا قیاس ہی تھا' مگر اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ درز ضرور وہاں موجود ہے۔"

کاؤنٹ نے سخت جز بز ہو کر مہمانوں کی طرف دیکھا اور کسی قدر غصیلی آواز میں کہا۔

"موسیو فلوریانی' میں حیران ہوں کہ آپ کی اس بات کا کیا جواب دوں۔ آپ مہمان کی حیثیت سے میرے مکان میں پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں اور اس قدر وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہیں' حالانکہ آپ کی نسبت میں اپنے مکان کی ایک ایک اینٹ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں۔"

"جناب' میں پھر کہتا ہوں کہ درز وہاں یقیناً" ہے۔ بے شک آپ مکان کی اینٹ اینٹ سے آگاہ ہیں' لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا' جائیے اور دیکھ لیجئے اگر میں جھوٹا نکلوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

بے حد مضطرب اور جوش میں آ کر کاؤنٹ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اب جانا ہی پڑے گا۔ جس دن سے ہار چوری ہوا ہے' وہ کمرہ اسی طرح بند پڑا ہے۔ وہاں کی کوئی چیز چھیڑی نہیں گئی۔ گھر یا باہر کا کوئی آدمی اس میں نہیں گیا اور آپ اس یقین سے فرما رہے ہیں جیسے وہ کمرہ اور اس کی ہر چیز آپ کی دیکھی بھالی ہے۔ پولیس کے ذہین ترین سراغرسانوں نے دنوں ہفتوں تفتیش کی ہے' کوئی چھوٹے سے چھوٹا سراغ انہیں نہیں ملا اور آپ مزے سے اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے قیاسات کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ تعجب ہے۔"

فلوریانی نے پائپ دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں جناب' میں خود ہی اس معاملے میں دخل دینا نہ چاہتا تھا

لیکن سب احباب نے پر زور اصرار کیا' تب میں نے اپنی رائے دی۔ اگر آپ کو اس رائے یا قیاس سے تکلیف ہوتی ہے تو لیجئے میں چپ ہوا جاتا ہوں' تاہم یہ پھر عرض کروں گا کہ اگر میری رائے پر آپ کو اعتماد نہیں تو خود جا کر کھڑکی کا معائنہ کر لیجئے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ جنرل صاحب یا ڈپٹی مجسٹریٹ صاحب کو گواہ کے طور پر ساتھ لے جائیے۔ اب کہئے میں اور کیا کروں؟"

"بہت خوب......... ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ آیئے کوئی صاحب میرے ساتھ زحمت فرما کر اس کمرے تک چلیں۔ ممکن ہے بعد میں میری بات کا موسیو فلوریانی یقین نہ فرمائیں۔"

ڈپٹی مجسٹریٹ ایم بوکاس جلدی سے اٹھ کر کاؤنٹ ڈاڈریو کے ساتھ چلا۔

☆ ☆ ☆

کوئی بیس منٹ بعد کاؤنٹ اور ایم بوکاس واپس آئے۔ اول الذکر کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا' آنکھوں میں پریشانی' ہونٹ خشک اور موخر الذکر پر حد درجہ حیرت و استعجاب کا عالم طاری۔ حاضرین محفل کی نگاہیں باری باری دونوں کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھتیں اور واپس آ جاتیں۔ کرسی پر دھم سے گرتے ہوئے' کاؤنٹ نے بھرائی ہوائی آواز میں کہا۔

"دراصل موسیو فلوریانی کا قیاس اس قدر دوراز عقل محسوس ہوا کہ......... مجھے یقین نہ آتا تھا......... مگر......... اور......... اب بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد نہیں ہوتا تاہم وہ درز وہاں موجود ہے......... یعنی اس گھومنے والی لکڑی کے ٹکڑے کے ساتھ ہی......... اوپر سے نیچے ایک باریک لکیر کی صورت میں......... خدا کی پناہ......... خدا کی پناہ......... کسی نے بھی اس درز کی طرف توجہ نہ دی........."

اس نے رومال نکال کر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ ایم بوکاس نے اس بیان کی تائید کی' پھر سب کے سب فلوریانی کو حیرت اور تعریف کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ کونٹس نے دفعتہ" فلوریانی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"موسیو' آپ کا ذہن بلاشبہ عجوبہ روزگار ہے........ اب براہ کرم بتایئے کہ چور نے کمرے کے اندر جانے کے بعد کیا کیا۔ یعنی وہ ہار کپڑوں کی الماری میں سے کس طرح نکالا؟"

فلوریانی نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پرے ہٹایا اور کہا۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں بات یہ ہے کہ چور اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ مادام کو وہ ہار گلے میں پہن کر شاہ ڈنمارک کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں جانا ہے' چنانچہ اس نے فوراً" اپنا منصوبہ گانٹھ لیا۔ جب آپ دونوں میاں بیوی واپس آئے' تو چور پہلے ہی سے دونوں کھڑکیوں کے درمیانی حصے میں تختہ رکھے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس درز میں سے جھانک کر دیکھ لیا کہ آپ لوگ ہار کہاں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب کاؤنٹ گہری نیند سو گئے تو اس نے تار کے ذریعے گھومنے والا ٹکڑا ہٹایا اور کھڑکی کا پٹ کھول لیا........"

"ٹھہریئے موسیو ایک لمحے کے لیے ٹھہریئے۔" کاؤنٹ نے کہا۔ "آدھی سے زیادہ کھڑکی تو دوسری الماری نے روک رکھی تھی۔ کسی آدمی کا اس تنگ سی جگہ میں سے گھس بیٹھ کر کمرے میں آنا محال تھا۔ کھڑکی کا وہ آدھا پٹ بھی پوری طرح نہیں کھل سکتا' پھر چور اندر کیسے آیا؟"

"اس لیے کہ آنے والا کوئی آدمی نہ تھا۔" فلوریانی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آدمی نہ تھا؟" سننے والے سب کے سب بیک وقت بول اٹھے۔

"خدا رحم کرے! اگر وہ آدمی نہیں تو پھر کون تھا؟"

"ایک چھوٹا سا بچہ۔"

"بچہ! کیا مطلب آپ کا؟ بچہ کدھر سے آ گیا؟"

"اب آپ بھول رہے ہیں موسیو ڈاڈریو۔ ابھی چند لمحے پہلے چوری کا واقعہ سناتے ہوئے آپ نے ذکر کیا تھا کہ مسز ہنریت کا ایک بچہ بھی تھا۔"

"آہ........ وہ لڑکا........ آپ راول کا ذکر کرتے ہیں' لیکن چھ سال کے اس

بچے.........."

"یقین فرمایئے جناب وہ چھ سال کا بچہ ہی آپ کا ہار چرا لے گیا۔"

"بخدا عقل باور نہیں کرتی کہ یہ کام اس لڑکے نے کیا ہو۔" کاؤنٹ چلایا۔ "وہ تو بہت سیدھا سادا' خاموش طبع اور شرمیلا لڑکا تھا۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں کوئی شکایت نہیں سنی۔"

"یقیناً" آپ کا ارشاد درست ہو گا' مگر بہرحال ہار کی چوری اسی سیدھے سادے' خاموش طبع اور شرمیلے لڑکے کا فعل ہے۔" فلوریانی نے کہا۔ "کہئے تو اس دعویٰ کا ثبوت بھی پیش کر دوں۔ لکڑی کا وہ لمبا سا تختہ جو اس لونڈے نے دونوں کھڑکیوں کے درمیان رکھا' باہر سے ہرگز نہ لایا گیا ہو گا۔ ورنہ کوئی نہ کوئی اس تختے کو ضروری دیکھ لیتا اور جاننا چاہتا کہ یہ تختہ کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تختہ گھر ہی میں سے حاصل کیا گیا۔ آپ پوچھیں گے کہاں سے؟ میں عرض کروں گا کہ جس کمرے میں مسز ہنریت اپنے لیے کھانا پکایا کرتی تھی۔ کیا اس کی کسی دیوار میں برتن بھانڈے وغیرہ رکھنے کے لیے تختے جڑے ہوئے ہیں؟"

"ہاں ہاں اس کمرے میں دو لمبے تختے برتن رکھنے کے لیے دروازے کے ساتھ والی دیوار پر جڑے ہوئے تھے۔" کونٹس نے جواب دیا۔

"لیجئے۔ میرا یہ قیاس بھی درست نکلا۔ اب یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تختے کیا بریکٹ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے یا اس سے الگ تھے۔ دوسری صورت میں وہ ذہین لڑکا بڑی آسانی سے ایک تختہ اتار کر اس سے دونوں کھڑکیوں کا درمیانی فاصلہ پاٹنے کا کام لے سکتا تھا۔ کاؤنٹ ڈاڈریو' آپ کو زحمت تو ہو گی' ذرا دوبارہ جا کر دیکھ لیجئے کہ میرا قیاس صحیح ہے یا غلط۔ اگر غور سے دیکھیں بھالیں' تو شاید لوہے کے تار کا وہ ہک بھی دستیاب ہو جائے جس سے آپ کی کھڑکی کا اندرونی گھومنے والا لکڑی کا ٹکڑا ہٹایا گیا تھا۔"

اس مرتبہ کاؤنٹ نے جرح بالکل نہ کی اور نہ فلوریانی کو جھٹلایا بلکہ چپ چاپ

اٹھ کر چلا گیا۔ حاضرین محفل حد درجہ دلچسپی اور تجسس کے جذبات دلوں میں لیے اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے، تاہم یہ حقیقت اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہو چکی تھی کہ موسیو فلوریانی کے اندازے اور قیاسات بالکل درست ہیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ جس انداز میں وہ واقعات کی کڑیاں ملاتا جاتا تھا وہ انداز ایک سراغرساں کا نہ تھا بلکہ ایسے شخص کا جو ان تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو اور اسے بیان کرنے میں کوئی دِقت نہ ہو رہی ہو۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ہی کاؤنٹ نے واپس آن کر اعلان کیا کہ موسیو فلوریانی کا ارشاد صحیح ہے۔ یہ اسی لڑکے راول کا کارنامہ تھا۔ ہر بات اسی کا جرم ثابت کرتی ہے۔ جنرل نے بے صبری سے پوچھا۔

"کاؤنٹ، کیا تم نے وہ تختے دیکھے اور تار کا وہ ہک بھی ملا؟"

"جی ہاں، دونوں تختے اپنی جگہ سے اکھڑے ہوئے رکھے ہیں۔ وہیں مجھے تار کا بنا ہوا یہ کانٹا بھی مل گیا۔ ذرا غور فرمایئے، کس مہارت سے اسے موڑ کر ہک بنایا گیا ہے۔ بخدا وہ لڑکا، تو آفت کا پرکالہ تھا۔"

"لیکن مجھے اب بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ واردات راول نے کی ہو گی۔ "کونٹس نے کہا۔" فرض کیجئے اگر راول ہی نے یہ حرکت کی تو ساری اسکیم اس کی چالاک ماں نے بنائی ہو گی۔"

"میرا قیاس اس کے برعکس ہے۔" فلوریانی نے کہا۔ "بے چاری ماں کا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ ساری اسکیم اسی لڑکے کے زرخیز دماغ کی پیداوار تھی۔"

"تعجب ہے۔" ایم بوکاس بولے۔ "حالانکہ ماں اور بیٹا ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ماں کو علم ہوئے بغیر لڑکے نے اتنا بڑا کام چپ چپاتے دکھا دیا ہو!"

"میں مانتا ہوں کہ ماں بیٹا ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ

و جاتی تھی تو لڑکا اٹھ کر اس واردات کی تیاریوں میں لگ جاتا تھا...... اس
..........“

”سوال یہ ہے کہ وہ ہار کہاں گیا؟“ کونٹس نے فلوریانی کی بات کاٹ کر کہا۔
وہ ہار اسی لڑکے نے چرایا ہوتا تو جب پولیس والوں نے ان کے سامان کی تلاشی
ی تو فوراً“ برآمد ہو جاتا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہار لڑکے کے
ے تھا۔“

”بظاہر یہی نظر آتا ہے' مگر ذرا غور کرنے سے یہ معما بھی حل ہو جائے گا۔“
ی نے جواب دیا۔ ”دیکھئے یہ ہمیں معلوم ہے کہ مسز ہنریت مکان سے باہر نکلنے
دی نہ تھی' لیکن لڑکا تو روز کسی نہ کسی کام سے یا پڑھنے کے لیے باہر جایا
.... میرا خیال ہے پولیس والے اگر ماں کے سامان کی تلاشی لینے کی بجائے
ی کتابوں کا بستہ ہی دیکھ لیتے تو ہار نکل آتا۔“

”موسیو فلوریانی ایک بات ابھی صاف نہیں ہوئی۔“ کونٹس نے کہا۔ ”آپ
یں کہ مسز ہنریت اپنے لڑکے کے جرم میں شریک نہیں تھی' پھر سوال یہ ہے کہ
ہزار اور پھر چار ہزار فرانک کی رقم ہر سال اسے کہاں سے ملتی ہے! کیا اس سے
نہیں ہوتا کہ وہ بھی اس واردات میں برابر کی حصے دار تھی!“

فلوریانی نے ہاتھ اٹھا کر مادام کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

”میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسز ہنریت اس جرم میں واقعی شریک تھی تو
ں دو ہزار اور پھر چار ہزار فرانک کی خطیر رقم ملنے کے بعد خط بھیج کر آپ کا
ادا کرتی؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ واردات ہونے کے بعد پولیس والوں نے اپنے طور
دن تک مسز ہنریت کی نگرانی کی اور اس کے خلاف کوئی ثبوت بہم نہ پہنچا سکے'
ں کا لڑکا راول ہر طرح اپنی نقل و حرکت میں آزاد تھا۔ وہ اپنی ذہانت اور
ری کے بل بوتے پر پیرس یا آس پاس کے کسی بھی شہر میں جا کر ضرورت کے
ایک دو ہیرے ہار میں سے نکال کر بیچ سکتا تھا۔ اس نے ہیرے جس جوہری کے

ہاتھ فروخت کیے' اس سے یہ شرط طے کرلی ہوگی کہ رقم ڈاک کے ذریعے
مسز ہنریت کو روانہ کی جائے تاکہ کسی کو شک و شبہ نہ ہو اور اگر پولیس تفتیش
تو ناکامی کے سوا اس کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ کہئے اب آپ لوگوں کو اطمینان ہوا
کاؤنٹ نے ہنس کر کہا۔

"موسیو فلوریانی' آپ کو تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیے۔ آپ اپنی
ذہانت اور قوت قیاسیہ کی وجہ سے بہت ترقی کرسکتے ہیں۔ آپ کے مرغ تخیل کی
بڑی بلند ہے۔"

کاؤنٹ کے لہجے میں طنز کی بے پناہ کاٹ سب نے محسوس کی' لیکن
طرف کسی کو بھی موسیو فلوریانی سے ہمدردی نہ تھی کیونکہ اس کی گفتگو میں
کاؤنٹ اور اس کی بیوی کے لیے تمسخر اور حقارت کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی
جنرل مارکوئیس اور ایم بوکاس نے قہقہوں میں موضوع بدلنے کی کوشش کی
فلوریانی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کاؤنٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جناب والا' جو کچھ میں نے عرض کیا' یقین فرمائیے اس کا تخیل سے ذرا
بھی واسطہ نہیں۔ یہ واقعات اسی شکل میں پیش آئے تھے اور ان کی نوعیت
ہے۔"

حاضرین نے بڑی مشکل سے اپنا استعجاب دبایا۔ کاؤنٹ کا چہرہ جوش ضبط
سرخ ہو گیا۔

"اس صورت میں........ شاید مجھے یہ دریافت کرنے کا حق پہنچتا ہے
کو ان واقعات کا صحیح صحیح علم کیوں کر ہوا؟"

"ان حالات کی مدد سے جو ابھی ابھی آپ نے ان سب خواتین و حضرات
سامنے بیان فرمائے ہیں۔" فلوریانی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوتا
اسے کاؤنٹ ڈاڈریو کے غم و غصے کی کوئی پروا نہیں۔ "ذرا مسز ہنریت اور اس
سالہ لڑکے راول کے حالات پر غور فرمائیے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ شریف

ی ہے' آپ میاں بیوی نے اسے گھر سے ایک دن کے نوٹس پر نکال باہر کیا۔ اس
بچاری نے پیرس سے دور ایک گاؤں میں پناہ لی۔ وہاں کس قدر مشکلوں میں ان
نے اپنی زندگی کے دن کاٹے ہوں گے اور جب مسز ہنریٹ بیمار پڑی' تو بچے نے
ماں کے علاج کے لیے ہار میں سے ایک ایک کر کے ہیرے نوچ کر بیچنے شروع
یہ ضروری نہیں تھا کہ جس زمانے میں اس نے ہار چرایا' اسی زمانے میں ہیرے
لے ہوں۔ یہ کام وہ بعد میں بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال اس کی ماں مر گئی۔ وقت
گیا۔ راول جوان ہوا اور پھر اچانک اس کے دل میں ایک بار پھر وہی مکان
کی خواہش بیدار ہوئی جس میں اس نے اپنے بچپن کے سنہری دن بسر کئے تھے
ہاں سے اس کی ماں کو چوری کے شبہے میں نکال دیا گیا تھا' حالانکہ وہ چوری اس
ں نے کی ہی نہیں تھی۔ وہ اس مکان میں گیا۔ کاؤنٹ اور اس کی بیوی سے ملا'
وں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔"

کاؤنٹ ڈاڈریو کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ آہستہ آہستہ وہ کرسی سے
ر کھڑا ہو گیا......... کونٹس ٹکٹکی باندھے فلوریانی کی طرف تک رہی تھی۔
ے خواتین و حضرات سب اپنی اپنی جگہ پتھر کے بے جان بتوں کی مانند بے حس و
بیٹھے تھے۔ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ دفعتہ" کاؤنٹ نے گرج
واز میں کہا۔

"میں پوچھتا ہوں موسیو فلوریانی' آپ ہیں کون؟"

فلوریانی نے قہقہہ لگایا اور پائپ کا گہرا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے میری گفتگو سے آپ کی طبیعت پر ناخوشگوار اثر پڑا ہے' اس
دب سے معافی چاہتا ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں' تو محترم دوست'
پ اتنی جلد مجھے بھول گئے۔ میرا پورا نام کیویلر فلوریانی ہے اور میں اٹلی کا رہنے
وں۔ یاد کیجئے نیپلز کے سب سے بڑے ریستوران میں پہلی مرتبہ میری آپ کی
ت ہوئی تھی اور ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔"

کاؤنٹ نے منہ بنا کر سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ کیویلر فلوریانی ہی ہیں، تو اس ڈرامے کا آخر کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ اسے آپ کھانے کے بعد کا مذاق یا دل لگی کہہ لیں۔ خواتین و حضرات میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر مسز ہنریت کا بیٹا راول اچانک یہاں آ جائے تو اسے یہ بیان کر کے کتنی مسرت ہو گی کہ ہار چرانے والا وہی تھا اور وہ محض اس لیے چوری پر مجبور ہوا کہ گھر کے مالکوں نے اس کی ماں کو ملازمت سے جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ تصور ہی راول کے لیے روح فرسا تھا۔ اس نے سوچا اگر ماں کی نوکری جاتی رہی تو پھر ان کی گزر بسر کیسے ہو گی! کیا راول کو تعلیم ترک کرنی پڑے گی......... راول کو اپنی ماں سے بڑی محبت تھی، وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے چنانچہ اس نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور ہار چرا لیا........."

یکایک فلوریانی کی حالت میں عظیم تغیر رونما ہوا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، رخسار آگ ہو گئے اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹنے لگے۔ اب کسی کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اصل میں ہے کون؟ ان تمام باتوں سے وہ قصداً" یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہی مسز ہنریت کا بیٹا راول ہے۔

☆ ☆ ☆

کاؤنٹ کی اندرونی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ اس کا ذہن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس نازک موقع پر کیا کرے۔ کونسا طرز عمل مناسب رہے گا؟ پولیس کو بلوایا جائے تاکہ سب لوگوں کے سامنے اس بدمعاش فلوریانی کی اصلیت ظاہر ہو اور وہ اپنی سزا کو پہنچے......... لیکن نہیں......... یہ ممکن نہیں......... اس واردات کو اتنے برس گزر گئے......... پھر اس وقت فلوریانی کی حیثیت ایک معزز مہمان کی سی ہے۔ اس کے علاوہ کون یہ مانے گا کہ برسوں پہلے ایک چھ سال کے لڑکے نے کونٹس کا قیمتی ہار چرایا تھا اور پھر اس کا ثبوت کہ یہی نوجوان فلوریانی اصل میں مسز ہنریت کا لڑکا راول

ہے............

کاؤنٹ نے ان سب باتوں کو ایک ایک کر کے مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے کاؤنٹ نے طے کیا کہ فلوریانی کی باتوں کو مذاق ہی کا ایک حصہ سمجھ کر ٹال دیا جائے' چنانچہ اس نے ایک دم ہنس کر کہا۔

"موسیو' کوئی شبہہ نہیں کہ آپ بے حد زندہ دل نوجوان ہیں' ایک لمحے کے لیے میں چکرا گیا اور اوٹ پٹانگ باتیں آپ کی شخصیت کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اب یہ فرمایئے کہ مسز ہنریت کے لائق اور ذہین بیٹے راول کا کیا حشر ہوا' دنیا میں اس نے کہاں تک کامیابی حاصل کی؟"

"دیکھیئے وہ بھی عرض کرتا ہوں۔" فلوریانی نے اپنی حالت پر قابو پا کر کہا۔ "راول نے دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کی بلکہ عظیم کامیابیاں کیئے۔ چھ برس کی عمر میں ایک تاریخی ہار کو بہترین منصوبہ بندی کے بعد چرا لینا کسی معمولی ذہن کا کام نہ تھا۔ پھر آپ یہ دیکھیئے کہ اس لڑکے نے اس منصوبے میں ذرا سی خامی بھی باقی نہ رہنے دی' یہاں تک کہ پولیس کے بڑے بڑے گرگے بھی سراغ پانے سے عاجز ہو گئے' حتیٰ کہ ایم ویلورب جیسے تجربے کار شخص نے اتنا بھی نہ دیکھا کہ کھڑکی کا ایک پٹ کھولا جا چکا ہے اور اس کی نچلی چوکھٹ' پاؤں کا نشان مٹانے کے لیے کپڑے سے صاف کی گئی ہے.......... کیا ایسا دور اندیش اور باکمال بچہ دنیا میں اپنی ناکامی کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ وہ جان گیا کہ غربت اور امارت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے اور اگر کوئی شخص بزم مے میں دوسروں سے پہلے ساغر اٹھانے کا خواہشمند ہو تو.........."

"ہاتھ بڑھائے اور ساغر اٹھا لے۔" جنرل مارکوئیس نے جملہ مکمل کر دیا۔

"ایک ہاتھ نہیں جناب' دونوں ہاتھ.........." فلوریانی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور قہقہہ لگایا۔

جنرل مارکوئیس' ڈپٹی مجسٹریٹ ایم بوکاس اور دوسرے کئی حضرات نے زندگی میں بڑے بڑے خطرناک اور نازک مرحلے دیکھے تھے' لیکن اس وقت جو اضطراب اور

تھرتھری ان کے رگ و پے میں دوڑی' اس سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ کس قدر حوصلے' جرأت اور نڈر پن سے وہ ان کے سامنے بیٹھا اپنے کارنامے کی روئیداد مزے لے کر بیان کر رہا تھا اور وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ یہ کیسا بھیانک انتقام تھا جو وہ کاؤنٹ اور کونٹس سے لے رہا تھا۔ اب کسی کو بھی اس کی اصل شخصیت کے بارے میں ذرہ برابر شبہ نہ رہا' تاہم کوئی زبان ہلانے کی جرأت نہ کر سکا۔

دفعتہً فلوریانی اپنی نشست سے اٹھ کر کونٹس کی کرسی کے قریب گیا اور جھک کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔ "مادام مجھے افسوس ہے کہ میرے اس بے وقت مذاق اور داستان سرائی سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی' کیونکہ وہ ہار آپ کا تھا اور غالباً آپ اسے مرتے دم تک فراموش نہ کر پائیں گی۔ کیا آپ مجھے اس گستاخی کے لیے معاف نہیں فرما سکیں گی؟"

کونٹس نے بڑی مشکل سے اپنی اس نفرت اور حقارت کو دبایا جو فلوریانی کے لیے اس کے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔ رسمی تبسم اس کے خشک لبوں پر نمودار ہوا اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں موسیو فلوریانی' مجھے آپ کی داستان سرائی یا مذاق سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس میں بڑی دلچسپی لی ہے اور اب مجھے یہ سوچ کر مسرت ہوتی ہے کہ میرا وہ ہار کسی فرد کی دنیا میں کامیابی و کامرانی کا باعث بنا......... مگر......... یہ تو کہئے کہ آپ کی رائے میں کیا وہ لڑکا......... راول......... پیدائشی چور نہ تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا خدا نے اسے اسی کام کے لیے پیدا نہ کیا تھا؟"

فلوریانی یوں چونک کر پیچھے ہٹا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ کونٹس کے لہجے میں چھپے ہوئے بے پناہ طنز کی کاٹ ہی ایسی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے مبہوت ہو کر کونٹس کو دیکھا' پھر فوراً مسکرا کر کہنے لگا۔

"آہ مادام! آپ کا ارشاد درست ہے......... جس طرح قدرت شاعروں' ادیبوں

اور سائنس دانوں کو پیدا کرتی ہے‘ اسی طرح ماہر فن چور بھی پیدائشی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی آپ کے اس تاریخی ہار کے معاملے میں کوئی خاص بات ہی ہو گی جو برابر راول کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی موسیو۔“ کونٹس نے کہا۔

”مطلب ظاہر ہے مادام۔“ فلوریانی کا لہجہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نہیں چاہتا تھا کہ ان سب معزز مہمانوں کے سامنے یہ راز ظاہر کروں‘ مگر آپ نے مجبور کر دیا ہے۔ جیساکہ آپ جانتی ہیں‘ ہار میں لگے ہوئے اکثر ہیرے نقلی تھے۔ ان میں سے صرف تین اصلی تھے‘ باقی نو ہیرے آپ لوگوں نے مالی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک ایک کر کے بیچ ڈالے۔“

کونٹس کا چہرہ ہلدی کی مانند زرد پڑ گیا‘ لیکن اس نے سنبھل کر بڑے تکبر سے کہا۔

”موسیو‘ ذرا زبان کو لگام دیجئے‘ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ ہار ایک معروف ملکہ کے نام نامی سے منسوب تھا اور یہ ایسی نازک بات ہے جو مرحومہ ہنریت کے چوٹے بیٹے کے دماغ میں نہیں آ سکتی۔ کبھی نہیں آ سکتی۔“

”تاہم میرا خیال بھی یہی ہے مادام کہ جب وہ ہار اس چوٹے نے پایا اور اسے مختلف جوہریوں کو دکھایا‘ تو اسے معلوم ہو گیا کہ یہ سب مصنوعی رکھ رکھاؤ ہے۔“

کاؤنٹ نے غصے سے بے قابو ہو کر اٹھنا چاہا‘ لیکن مادام نے اسے اشارے سے روک دیا۔

”موسیو فلوریانی‘ اگر اس چھوکرے راول میں غیرت کی ذرا سی بھی رمق باقی ہو تو.........“

فلوریانی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ان سے شعلے نکلنے لگے۔ کونٹس دہشت کے مارے جملہ مکمل کرتے کرتے رہ گئی۔

”ہاں فرمائیے مادام۔“ فلوریانی نے بھاری آواز میں کہا۔ ”اگر اس چھوکرے

راول میں غیرت کی ذرا سی بھی رمق باقی ہو تو..........؟"

"وہ مصنوعی ہار اب جیسا بھی کچھ بچ گیا ہے' وہی واپس کر دے۔" کونٹس نے تیزی سے کہا۔

"مادام مجھے پورا یقین ہے کہ ہار کا وہ حصہ جو خالص سونے کا بنا ہوا ہے' ابھی تک راول کے قبضے میں ہے اور اس نے اسے فروخت نہیں کیا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ یہ ہار خاندان ڈاڈریو کو واپس کر دے تاکہ اس خاندان کی اونچے حلقوں میں جو عزت بنی ہوئی ہے' اس پر حرف نہ آنے پائے۔ خواتین و حضرات میں نے آپ کی آج بڑی سمع خراشی کی۔ اس کے لیے دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

فلوریانی نے دوسرے کمرے میں جا کر اپنا اوورکوٹ' ہیٹ اور چھڑی اٹھائی' ایک بار پھر واپس آن کر سکتے کے عالم میں بیٹھے ہوئے مہمانوں کو سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔

اس واقعے کے ٹھیک چار دن بعد مخمل کا وہی ڈبا مادام ڈاڈریو کی خواب گاہ میں میز پر رکھا ہوا پایا گیا۔ اس نے جلدی سے ڈبا کھولا۔ اس میں ملکہ میری انتونتی کا ہیروں سے محروم ہار بڑی نفاست سے رکھا تھا۔

*

۳ بیویوں کا قاتل

لندن سے شائع ہونے والے صبح کے اخبارات میں 2 ر فروری 1915ء کو ایک سنسنی پیدا کرنے والی خبر چھپی۔ جس میں درج تھا کہ پولیس نے ایک 43 سالہ شخص جان لائیڈ کو مسٹر ہا پکنس مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا کیونکہ اس نے 17 ر دسمبر 1914ء کو باتھ کے مقام پر شادی کے سرٹیفکیٹ میں جعلی اندراج کرایا تھا۔ میٹروپولیٹن پولیس کے انسپکٹر' نیل نے مجسٹریٹ کے سامنے انکشاف کیا کہ جس روز جان لائیڈ کی شادی ہوئی تھی اس کے اگلے دن اس کی بیوی مردہ پائی گئی اور اس حالت میں کہ بد نصیب دلہن نہانے کے ٹب میں ڈوب گئی تھی۔ یہ واقعہ پُر اسرار تھا........ کہ ایک عورت اپنی شادی کے چوبیس گھنٹے بعد محض اتفاقیہ طور پر ہلاک ہو جائے اور اس سے بھی زیادہ یہ امر حیرت انگیز تھا کہ ملزم جس کا اصل نام جارج جوزف سمتھ ہے' ایک سال پہلے بھی ایک شادی کر چکا تھا اور وہ عورت بھی اسی طرح نہانے کے ٹب میں ڈوب کر ہلاک ہوئی تھی۔ کیا اسے بھی محض اتفاقی حادثہ قرار دیا جا سکتا تھا؟ اس بارے میں ملزم کا اصرار تھا کہ دونوں بیویاں اتفاقیہ طور پر ہی ڈوب کر مری تھیں اور اسے سوائے اس کی بد نصیبی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

لیکن جارج سمتھ کی "بد نصیبی" کا راز تحقیق کرنے پر کھل گیا۔ کیونکہ 15 فروری کو اس پر "تین بیویوں" کو ہلاک کرنے کا جرم عائد کیا گیا' اور وہ تینوں پانی کے ٹب میں ڈوب کر مری تھیں۔ تین بیویاں......... بیٹریک منڈی' ایلس برن ہام اور مارگریٹ لوفٹی......... ظاہر ہے کہ یہ اتفاقیہ حادثہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

واردات کے اصل واقعات یہ تھے۔

پہلی بیوی مس بیٹریک منڈی کی عمر اس وقت 25 سال تھی' جب اس کا رنڈوا باپ اس عالم فانی سے رخصت ہوا۔ وہ اپنی لڑکی کے لیے دو ہزار پانچ سو پونڈ کی خطیر رقم ورثے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس رقم سے لڑکی نے خوب گلچھرے اُڑائے۔ اس نے سیروسیاحت اور تفریح کے وسیع پروگرام بنانے شروع کیے۔ 1910ء کے موسم گرما میں وہ کلفٹن کے بورڈنگ ہاؤس میں قیام پذیر تھی۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر برسٹل شہر میں جارج جوزف سمتھ نے پرانا اور استعمال شدہ سامان بیچنے کی دکان کھول رکھی تھی۔ ایک روز سمتھ نے مس منڈی کو دیکھا' جو اس کی دکان پر کچھ خریدنے آئی تھی۔ باتوں باتوں میں اسے علم ہو گیا کہ لڑکی مال دار ہے اور اکیلی ہی تفریح کر رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس موٹی مرغی کو اپنے جال میں پھانسنا چاہیے۔ اس نے محسوس کیا' کہ 33 سال کی یہ لڑکی عقل سے بھی کوری ہے' لہٰذا جلد ہی جال میں پھنس جائے گی۔ چنانچہ اس نے لڑکی سے تعلقات بڑھائے۔ اپنی چرب زبانی اور چکنی چُپڑی باتوں سے اسے رام کر لیا اور جب دیکھا کہ لڑکی اس میں کافی دلچسپی لینے لگی ہے تو اسے شادی کا پیغام دے دیا۔

26 اگست کو لڑکی کے ماموں کو جو اس کی جائیداد کا ٹرسٹی بھی تھا' ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ۔

"پیارے ماموں! میں نے آج شادی کر لی ہے۔ میرا شوہر آج شام خود آپ کو خط لکھ رہا ہے۔

آپ کی صادق
بی' ولیمز

لیکن ابھی اس شادی کو تین ہفتے سے زائد عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ "مسٹر ولیمز" اپنی بیوی کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود لڑکی کی دولت اپنے قبضے میں لانے سے ناکام رہا تھا۔ البتہ اس دوران میں اس نے فریب دے کر 135 پونڈ کی رقم ہتھیا لی اور اسے لے کر چلتا بنا۔ اور مس منڈی' شادی کے باوجود "مس" ہی رہی' چونکہ یہ شادی ناجائز تھی۔ جوزف سمتھ اس سے پہلے شادی شدہ تھا۔ شوہر کے اس طرح غائب ہو جانے کے بعد بیچاری لڑکی کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔ کیونکہ وہی 135 پونڈ کی رقم اس کے حساب میں ٹرسٹی نے بنک میں جمع کرائی تھی۔ اٹھارہ ماہ کا نہایت تکلیف دہ عرصہ گزارنے کے بعد مارچ 1912ء میں آخر کار اس نے اپنے گم شدہ شوہر کو ڈھونڈ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ لڑکی اب بھی اس کے لیے خاصی فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جوزف نے لڑکی سے کہا کہ وہ ماضی کی غلطیوں کو فراموش کر کے اسے معاف کر دے۔ بھولی بھالی لڑکی پھر رضا مند ہو گئی اور دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے لگے۔

15 مارچ کو قانونی مشیروں کی ایک فرم نے لڑکی کے ٹرسٹی کو اطلاع دی کہ مسٹر اور مسز ولیمز نے آپس کے اختلافات دور کر کے صلح کر لی ہے اور وہ دونوں دوبارہ میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کرنے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔

اس اطلاع کے فوراً" ہی بعد ٹرسٹی سے مزید روپیہ بھیجنے کا مطالبہ شروع کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ انہوں نے کافی روپیہ ٹرسٹی سے منگوا لیا۔ جو سیرو تفریح اور مختلف قسم کی عیاشیوں پر صرف ہوتا رہا۔ گھومتے گھومتے دونوں میاں بیوی کینٹ پہنچ گئے۔ جہاں جوزف سمتھ نے بیس مئی کو ہارنی بے کے نزدیک ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا۔ باقی روپے سے انہوں نے مکان کو سجانے کے لیے فرنیچر بھی کرایے پر لے لیا۔ مصیبت یہ تھی کہ روپیہ کی بڑی مقدار اب بھی ٹرسٹی کے قبضے میں تھی اور سمتھ کو لمبا ہاتھ مارنے کا کوئی مناسب موقع نہیں ملتا تھا۔ سمتھ نے کہیں سے معلوم کیا کہ اگر "مسز ولیمز" وصیت کے بغیر مر جائے تو اس کی کل جائیداد اور مال و دولت کا

وارث اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو گا۔ لیکن اگر وہ مرنے سے پیشتر اپنے خاوند کے حق میں وصیت کر جائے تو ساری دولت اس کے خاوند کو منتقل ہو جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی سمتھ نے گویا اپنی نام نہاد بیوی کی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دیئے اور وہ اسے ہلاک کرنے کے منصوبے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح مسز ولیمز کو اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی وصیت میں تمام جائیداد اور روپیہ کا وارث صرف اپنے شوہر کو قرار دے دے۔ آخر 8 جولائی کو قانونی طور پر یہ وصیت نامہ مکمل کر لیا گیا اور مسٹر سمتھ کے لیے رستہ ہموار ہو گیا۔ دوسرے ہی روز یعنی 9 جولائی کو اس نے ایک کباڑیئے کی دکان سے نہانے کا ایک پرانا ٹب اس شرط پر لیا کہ وہ اسے استعمال کر کے دیکھے گا اور قیمت بعد میں ادا کی جائے گی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اگلے روز اس نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا اور ایک ڈاکٹر کے مطب میں جا پہنچا اور اس سے کہا کہ میری بیوی کو اکثر ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں اس کا کوئی علاج کیا جائے ڈاکٹر نے جب مسز ولیمز کا طبی معائنہ کیا تو مرض کی کوئی علامت محسوس نہ ہوئی۔ خود مسز ولیمز بھی حیران تھی کہ اسے کبھی ہسٹریا کا دورہ نہیں پڑا۔ اس کے خاوند نے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے۔ بہرحال وہ اسے ایک مذاق سمجھ کر خاموش رہی۔ چنانچہ اس قسم کا ایک اور "دورہ" اسے دو روز بعد پڑا۔ اسی ڈاکٹر کو گھر پر بلوایا گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسز ولیمز مریض بنی بستر میں لیٹی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر طبی معائنہ کیا لیکن کسی مرض کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ آخر اس نے ایک تسکین دِہ دوا کا نسخہ لکھ دیا اور واپس چلا گیا۔

اس سے اگلے روز، یعنی تیرہ تاریخ کو صبح آٹھ بجے ایک مرتبہ پھر اسی ڈاکٹر کو فوری طور پر گھر بلوایا گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ مسز ولیمز پانی سے لبالب بھرے ہوئے ٹب میں اس حالت میں مردہ پڑی تھی کہ اس کا چہرہ پانی کے اندر تھا اور ہاتھ میں صابن کی ٹکیہ پکڑی ہوئی تھی۔ جس وقت یہ "حادثہ" رونما ہوا اس وقت "مسٹر ولیمز" مچھلی خریدنے بازار گیا ہوا تھا۔ تفتیش مرگ کی عدالتی کارروائی لازمی تھی اور اس کے

لیے 15 تاریخ مقرر کی گئی۔ اس روز جیوری نے فیصلہ دیا کہ متوفیہ پر چونکہ غشی کے دورے پڑتے تھے اس لیے وہ نہانے کے دوران پانی کے ٹب میں بے ہوش ہو کر ڈوب گئی۔ چنانچہ اس کی موت محض اتفاقی حادثہ قرار دے دی گئی اور متوفیہ کو ہارنی بے کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

اس طرح مسٹر سمتھ قانونی طور پر اپنی بیوی کے روپے پر قابض ہو گیا اور اسے دو ہزار چار سو پونڈ کی خطیر رقم حاصل ہو گئی اور اس رقم سے اس نے مزید شکار پھانسنے اور دولت کمانے کے پروگرام بنائے۔ اکتوبر 1913ء میں اس کی ملاقات بکنگھم شائر کی ایک 25 سالہ لڑکی' ایلس برن ہام سے ہوئی۔ یہ لڑکی بڑی صحت مند اور چست چالاک تھی۔ اس کے والدین مفلس نہیں تھے اور لڑکی خود بھی نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کر چکی تھی اور ان دنوں وہ پورٹس ماؤتھ میں ایک عمر رسیدہ مریض کی دیکھ بھال کرنے پر ملازم تھی۔ ایک روز مسٹر سمتھ کی ملاقات مس ایلس سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں اسے علم ہو گیا کہ ایلس اپنے والدین کی اکلوتی بچی ہے اور وہ کافی دولت مند لوگ ہیں۔ لڑکی بھی کچھ دل پھینک واقع ہوئی تھی اس نے مسٹر سمتھ کو پسند کیا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ اس کا والد بڑا جہاں دیدہ شخص تھا' اس نے مسٹر سمتھ کو دیکھنے کے بعد اپنی بیٹی کو اس شخص سے تعلقات قائم رکھنے سے منع کیا۔ لیکن مس ایلس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا اس نے باپ کی کوئی نصیحت نہ مانی اور چند روز بعد رجسٹرار کے دفتر میں سمتھ سے شادی رچالی۔

ان دنوں ایلس برن ہام کے پاس ایک سو چالیس پونڈ کی رقم تھی جو مسٹر سمتھ نے چند ہی روز میں ہتھیا کر صرف کر ڈالی۔ ایلس نے اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اپنی پانچ سو پونڈ میں زندگی کا بیمہ کرا چکی ہے اور انشورنس کا سارا پریمیئم بھی ادا کر چکی ہے۔ یہ سن کر سمتھ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ایلس سے اس شدت کا اظہار محبت کیا کہ وہ وصیت میں اپنی ہر شے سمتھ کے نام لکھ دینے پر رضا مند ہو گئی' اور ایک روز قانونی طور پر یہ وصیت نامہ مکمل کر لیا گیا اور پھر دسمبر 1913ء کی ایک رات کو

بلیک پول کے ایک ہوٹل میں رات کے آٹھ بجے جہاں یہ دونوں "ہنی مون" منا رہے تھے، نہانے کے ٹب میں ایلس برن ہام کی لاش پائی گئی۔ اس مرتبہ بھی موت کی تفتیش کی عدالتی کارروائی ہوئی۔ جو نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ ایلس برن ہام اختلاج قلب کی مریضہ تھی اور یہ فرض کر لیا گیا کہ غسل کے دوران اس پر اختلاج قلب کا دورہ پڑا اور وہ ٹب میں ڈوب گئی اور اختلاج کا باعث موٹاپے کا مرض تھا۔ چنانچہ مسٹر سمتھ نے بھی "حلفیہ شہادت" دی کہ اس کی بیوی کو دل کے دورے پڑتے تھے۔ چنانچہ جیوری کے ارکان نے موت کو اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہوئے تحقیقات ختم کر دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مسٹر سمتھ نے انشورنس کمپنی سے چھ سو پونڈ کی رقم وصول کر کے جیب میں ڈالی اور ایک مرتبہ پھر وہ نئے شکار کی تلاش میں چل نکلا۔

بورن ماؤتھ میں اس کی ملاقات مس ایلس ری ویل سے ہوئی۔ مسٹر سمتھ نے اسے اپنا نام چارلس اولیور جیمز بتایا۔ یہ لڑکی لندن میں ایک امیر گھرانے میں خادمہ کی حیثیت سے ملازم تھی۔ سمتھ نے اس سے چکنی چپڑی باتیں کیں اور دلچسپ لطائف اور قصے سنا کر اپنا گرویدہ کر لیا۔ ان دنوں لڑکی رخصت پر بورن ماؤتھ آئی ہوئی تھی۔ واپسی پر ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ سمتھ کو معلوم ہو گیا کہ ایلس ری ویل نے سیونگ بنک میں ستر پونڈ کی رقم جمع کرا رکھی ہے۔

17 ستمبر 1914ء کو دونوں نے شادی کا فارم پر کیا اور رجسٹرار کے دفتر میں پہنچ کر رشتہ زوجیت میں منسلک ہوئے۔ سمتھ نے "بیوی" کو بہلا پھسلا کر ساری رقم نکلوا لی اور گھر سے غائب ہو گیا۔

لندن سے رفو چکر ہو کر مسٹر سمتھ برسٹل پہنچا جہاں ایک نواحی گاؤں میں اس کی ملاقات 38 سالہ مارگریٹ لوفٹی سے ہوئی جو اپنی بیوہ والدہ اور دو بہنوں کے ہمراہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ سمتھ نے اسے اپنا نام جان ملائیڈ بتایا اور کہا کہ وہ زمین کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے۔ مس مارگریٹ نے سات سو پونڈ میں

اپنی زندگی کا بیمہ کرا رکھا تھا اور اس نے پہلے ہی سے یہ وصیت لکھوا دی تھی کہ میری موت پر سارا روپیہ میرے خاوند کو ادا کر دیا جائے۔ مسٹر جان سے ملاقات ہونے پر مارگریٹ نے محسوس کیا کہ یہ شخص بہترین شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ والدہ اور بہنوں سے چوری چھپے اس سے ملتی رہی اور ایک روز وہ لندن جانے کے بہانے بجائے ساتھ باتھ کے مقام پر شادی کے دفتر میں پہنچی اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد یہ جوڑا مارگریٹ کی ایک سہیلی مِس لوزیا کے مکان پر قیام کے لیے پہنچا جو بسمارک روڈ پر رہتی تھی۔ انہیں دوسری منزل پر ایک کمرہ دیا گیا۔ مسٹر لائیڈ نے "غسل خانے" کے بارے میں دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ غسل خانہ پہلی منزل پر ہے۔

دوسرے روز جب میاں بیوی باہر سیر کے لیے اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تو مسٹر لائیڈ نے میزبان خاتون کو بتایا کہ مارگریٹ کے سر میں رات کو شدید درد رہا۔ بہرحال شام تک گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں مکان پر واپس آئے تو مسز لائیڈ نے میزبان خاتون سے کہا کہ غسل خانے کے ٹب میں گرم پانی بھروا دیا جائے کیونکہ وہ تھکن دور کرنے کے لیے غسل کرنے کی خواہش مند ہے۔ چنانچہ شام کے ساڑھے سات بجے مِس لوزیا نے مسز لائیڈ سے کہا کہ پانی ٹب میں تیار ہے۔ یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے کے لیے چلی گئی۔ وہاں اس نے سنا کہ کوئی غسل خانے میں داخل ہوا اور پھر پانی گرنے اور نہانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ مِس لوزیا کو سنائی دی' اور پھر اس کے بیان کے مطابق پھر مجھے یوں معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ٹب میں گر پڑا' پھر ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

لیکن چند ہی لمحوں بعد بیٹھک میں سے ہارمونیم بجنے کی آواز آئی اور پھر مسٹر لائیڈ کے گانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

مِس لوزیا بدستور باورچی خانے میں کام کرتی رہی۔ اس کے بیان کے مطابق چند منٹ تک باجا بجتا رہا پھر اچانک دروازہ زور سے کھلا اور مسٹر لائیڈ ہاتھ میں ایک کاغذ کا تھیلا لیے برآمد ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ "میری بیوی ابھی تک غسل خانے سے

باہر نہیں نکلی؟" نفی میں جواب ملنے پر وہ غسل خانے کی طرف گیا اور زور سے آ
دی۔

"مارگریٹ"

پھر مس لوزیا نے اسے غسل خانے کے دروازے پر کھڑا پایا' وہ کہہ رہا تھا۔
"کیا معاملہ ہے؟ غسل خانے میں اندھیرا کیوں ہے۔" اور پھر ایک لمحہ بعد ز
سے چلایا۔

"غصب ہو گیا........ وہ ٹب میں گر پڑی ہے........ جلد ادھر آؤ۔ اسے با
نکالیں۔"

لیکن اب مارگریٹ کو باہر نکالنا بے سود تھا وہ ٹب میں غرق ہو کر مر چکی تھی۔
20 دسمبر 1914ء کے "نیوز آف دی ورلڈ" میں جب اس حادثے کی خبر چھ
تو مسٹر براؤن کی نظر سے بھی یہ اخبار گزرا انہیں سخت تعجب ہوا کہ ایک سال پہلے ا
کی بیٹی ایلس برن ہام بھی اسی طرح شادی کے دوسرے دن ٹب میں گر کر ہلاک ہو گ
تھی۔ ان کے دل میں شک گزرا کہ ضرور وہی آدمی اس حادثے کا ذمہ دار ہو گا جس
نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی لیکن اخبار میں اس شخص کا نام جان لائیڈ درج تھا۔
بہرحال انہوں نے پولیس کو اپنے شبے سے مطلع کیا جس نے فوراً" ہی تفتیش شروع کر
دی اور پھر یہ معاملہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی سی آئی ڈی کے سپرد کر دیا گیا جس نے بنکوں
کے اکاؤنٹس کا معائنہ کیا اور ڈیڑھ سو کے قریب گواہوں کے بیانات حاصل کیے اور
آخر مسٹر سمتھ کو قتل کی تین وارداتوں کا ارتکاب کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا
اور جون 1915ء میں لندن کی مشہور عدالت "اولڈ بیلے" میں اس بد نام ترین مقدمے
کی سماعت شروع ہوئی جو کامل آٹھ روز تک جاری رہی۔ آخر سمتھ کو مجرم قرار دے
کر موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ قاتل نے اپیل دائر کی لیکن مسترد کر دی گئی اور 13
اگست 1915ء کو اسے میڈ سٹون میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

*

ڈریکولا اور شرلک ہومز

شرلک ہومز نے آخری ڈاک میں آیا ہُوا خط کھول کر پڑھا اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر خط کا چھوٹا سا پرزہ میری طرف اُچھال دیا۔ "لو والٹن' ذرا بتاؤ کہ تم اس سے کیا نتیجہ اَخذ کرتے ہو۔ اس دورِ جدید میں اب بھی خدا کے بعض بندے ایسے ہیں جو ڈریکولا کے حقیقی وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم نے کاؤنٹ ڈریکولا کا نام سنا ہو گا؟"

"بے شک۔" میں نے جواب دیا۔ "کاؤنٹ ڈریکولا اسکاٹ لینڈ کے شہرۂ آفاق ڈراؤنی کہانیاں لکھنے والے ادیب بریم اسٹوکر کے ذہن کی لازوال تخلیق ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو اپنی خباثتوں کے باعث مرنے کے بعد ایک خوں آشام چمگادڑ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنی قبر سے برآمد ہوتا ہے اور انسانوں کا خون چوس کر اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ وہ جس آدمی یا عورت کا خون چوس لے اور وہ مرجائے تو مرنے والا خود خوں آشام چمگادڑ کا روپ دھار لیتا ہے۔ اسے ویمپائر بھی کہتے ہیں۔"

"بہت خوب۔" شرلک ہومز مسکرایا۔" معلوم ہوتا ہے تم نے اس موضوع پر

خاصا مطالعہ کیا ہے' بہرحال یہ خط پڑھ کر بتاؤ کیا ڈریکولایا ایسے ہی کسی خو
وجود اس جدید دور کے انگلستان میں ممکن ہے۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے کہا اور ہومز کے دیئے ہوئے کاغذ پر نظر ڈالی........
لکھا تھا۔

"ہمارے ایک مؤکل مسٹر رابرٹ فرگوسن ہیں جو چائے کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے خوں آشام چمگادڑوں کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ ہم نے مسٹر رابرٹ فرگوسن سے کہا کہ اس سلسلے میں وہ آپ سے رجوع کریں۔ شاید وہ آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔ آپ نے پہلے بھی ایک خاص نوعیت کے کیس میں ہماری مدد کی تھی جس کے لیے ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔ امید ہے کہ جناب والا' اس کام کے لیے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ حصہ ضرور نکالیں گے۔

آپ کے ہر طرح خدمت گزار

موریسن موریسن اینڈ ڈوڈ مشیران قانون

42۔ اولڈ جیروے۔

یہ عجیب وغریب خط پڑھ کر میں نے سوالیہ انداز میں ہومز کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا:

"بکواس... بالکل بکواس... بھلا مجھے ڈریکو لایا اس جیسے کسی خوں آشام ویمپائر سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں ایسے مہمل معاملات میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ویمپائر ہی خوں آشام ہو۔ کوئی چلتا پھرتا' جیتا جاگتا انسان بھی تو خوں آشام ہو سکتا ہے۔ خود میں نے ایسے واقعات پڑھے اور سنے ہیں کہ عالم دیوانگی میں کسی فرد نے اپنے آپ کو ویمپائر فرض کر کے دوسرے انسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیا یا بعض عمر رسیدہ لوگوں نے اپنی جوانی برقرار رکھنے کے لیے یہ نسخہ استعمال کرنا چاہا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر د

جوان کا خون اپنی رگوں میں پہنچا سکیں تو وہ بڑھاپے سے نجات پاکر دوبارہ جوان ہو
ائیں گے' حالانکہ اب ثابت ہو چکا ہے کہ خون کے گروپ الگ الگ ہوتے ہیں۔
ور یہ یقینی نہیں ہوتا کہ میرا خون آپ کے خون سے ضرور میل کھا جائے۔ غلط خون
سم میں پہنچ جائے تو موت واقع ہو سکتی ہے۔"

"میں یہ سب باتیں جانتا ہوں"۔ ہومز نے کہا۔ "لیکن یہ مشیران قانون اپنے
ط میں بہرحال ویمپائر کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جنوبی برازیل کے جنگلوں
ور تاریک پہاڑی غاروں میں ایسی چمگادڑیں پائی جاتی ہیں جو خون چوس کر زندہ رہتی
ہیں۔ لیکن ویمپائر کے تصور سے جو عجیب عجیب ڈراؤنی کہانیاں عوام و خواص میں
شہور ہیں' میں انہیں حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ کوئی فرد
پاگل ہو کر اپنے آپ کو' غیر شعوری طور پر' ویمپائر سمجھنے لگے اور جب بھی اسے موقع
ملے' وہ دوسرے فرد پر حملہ کر دے' لیکن اس خط میں ایسا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ ہاں
یہ ممکن ہے کہ مسٹر رابرٹ فرگوسن ہمیں اس سلسلے میں کچھ دلچسپ واقعات سے آگاہ
کریں۔ ذرا دیکھنا واٹسن' یہ دوسرا لفافہ کس کی طرف سے ہے۔ اگر میرا اندازہ غلط
نہیں تو یہ مسٹر فرگوسن ہی کا خط ہو گا۔"

اور اس سے پہلے کہ میں دوسرا لفافہ چاک کروں' ہومز نے خود لفافہ اٹھا کر
کھولا اور اس میں سے جو کاغذ نکلا اسے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ میں اس کے چہرے
کے ہر لحہ بدلتے تاثرات سے قیاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خط کی عبارت کیا
ہے لیکن صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ہومز کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ پھیل جاتی کبھی
اس کے لب سختی سے بھنچ جاتے اور پیشانی پر لکیریں نمودار ہو جاتیں۔ کبھی اس کی لمبی
مضبوط ناک کا آدھا حصہ سرخ ہو جاتا اور نتھنے پھڑکنے لگتے' کبھی وہ بہت مختصر سے
وقفے میں آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا' پھر یک لخت آنکھیں کھول کر آپ ہی آپ
مسکراتا۔ بہرحال مجھے اتنا تو پتہ چل گیا کہ یہ تحریر اس کی حد درجہ دلچسپی کا باعث بن
رہی ہے۔

پورا خط پڑھ لینے کے بعد اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور میری موجودگی یکسر فراموش کر کے گہرے غور و فکر میں گم ہو گیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی اور ایسے موقعوں پر میں اسے چھیڑا نہیں کرتا۔ وہ خود ہی تھوڑی دیر بعد واپس آجاتا تھا۔ چنانچہ میں صبر سے بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ خط ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ دفعتہً اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک گہرا سانس لیا اور مجھ سے کہا:

"واٹس! یہ قصبہ لیمبرلے کس جگہ واقع ہے؟"

"سسکس ـــ ہورشم کے جنوب میں۔"

"لندن سے زیادہ دُور تو نہیں ... دراصل لیمبرلے کے بجائے مجھے چیس مین کہنا چاہیے تھا۔"

"چیس مین؟ بے شک یہ لیمبرلے کے ساتھ ہی ہے اور میں ایک مرتبہ وہاں گیا ہوں۔ بہت قدیم چھوٹا سا قصبہ ہے۔ صدیوں پرانے مکان یہاں ابھی تک موجود ہیں..."

"خوب۔ یہی میرا قیاس تھا۔" ہومز نے کہا۔ "خط جو میں نے ابھی ابھی پڑھا' مسٹر رابرٹ فرگوسن ہی کا ہے اور وہیں سے آیا ہے... تم خود پڑھ لو... یہ شخص تمہیں جانتا ہے..."

"مجھے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ کیسے؟"

ہومز نے خط مجھے تھما دیا۔ میں نے جلدی سے پڑھنا شروع کیا:

"مسٹر شرلک ہومز! امید ہے مزاجِ بخیر ہوں گے۔ میرے مشیرانِ قانون نے ہدایت کی ہے کہ میں یہ معاملہ آپ کی خدمت میں پیش کروں اور پورے انگلستان میں شاید آپ واحد آدمی ہیں جو اس معاملے کو نہ صرف سمجھ سکیں گے بلکہ اسے نمٹانے میں بھی مدد کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات اس قدر پیچیدہ' ناقابلِ فہم اور عجیب ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا' انہیں کیسے بیان کروں۔ بہرحال اپنی قابلیت کے مطابق

عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں یہ واضح کر دوں کہ معاملہ میرا ذاتی نہیں' بلکہ میرے
ایک دوست کا ہے۔ کوئی پانچ برس ہوئے میرے اس دوست نے دوسری شادی کی۔
اس کی پہلی بیوی کچھ عرصہ ہوا' انتقال کر گئی تھی۔ پہلی بیوی سے میرے دوست کا
ایک لڑکا بھی ہے جس کی عمر اس وقت پندرہ برس کی ہو گی۔ میرا دوست اپنے کاروبار
کے سلسلے میں اکثر سفر کرتا رہتا ہے۔ ایسے ہی کاروباری سفر کے دوران میں اس کی
ملاقات ایک غیر ملکی تاجر اور اس کی خوبصورت نوجوان بیٹی سے ہوئی۔ تعلقات استوار
ہوئے اور ایک دن ایسا آیا کہ میرے دوست کی شادی اس لڑکی سے ہو گئی' لیکن
بدقسمتی سے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میرے دوست اور اس کی بیوی کے تعلقات کچھ
کشیدہ سے ہونے لگے۔ دراصل وہ اپنی بیوی کی بعض پُر اسرار حرکتوں اور ناقابلِ فہم
عادتوں کے باعث خائف تھا اور کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ ایسا کیوں
کرتی ہے..........

"دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس کی بیوی اس سے بے حد محبت کرتی
ہے۔ ایسی محبت جو آج کل بہت کم بیویاں اپنے شوہروں کو دیتی ہیں۔ اس خط میں تمام
حالات کا درج کرنا مشکل ہے میں جب آپ سے ملوں گا تو تفصیل سے سب کچھ عرض
کروں گا۔ مقصد اس خط سے صرف یہ ہے کہ حالات اور واقعات کا ایک ایسا خاکہ
آپ کے سامنے آ جائے جس سے آپ آئندہ اپنی تفتیش میں کچھ مدد لے سکیں۔
(بشرطیکہ آپ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے پر رضا مند ہوں) میرے دوست کی
دوسری بیوی اپنے سوتیلے بیٹے سے کچھ خوش نہیں ہے' حالانکہ وہ لڑکا بے حد شرمیلا'
سیدھا سادا اور کم گو ہے۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔
اس کے باوجود اسے جھڑکتی اور ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہے۔ یہ لڑکا بچپن میں کسی حادثے کا
شکار ہونے کے باعث کچھ اپاہج بھی ہے۔ ایسے بچے سے تو ہر کوئی پیار اور محبت کا
سلوک کرے گا' لیکن میرے دوست کی بیوی کم از کم دو مرتبہ اس لڑکے کو بے رحمی
سے پیٹتی ہوئی پائی گئی.........."

"ایک مرتبہ اس نے لڑکے کے بازو پر اس زور سے بید مارا کہ اس کا نشان ابھی تک موجود ہے۔ خیر یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جس کا تذکرہ کیا جائے۔ سوتیلی ماؤں کا رویہ اپنے شوہر کی پہلی اولاد سے عموماً" ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ میرے دوست کی بیوی کا رویہ اپنے حقیقی بچے سے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک سال قبل اس بیوی نے ایک صحت مند اور خوب صورت لڑکے کو جنم دیا۔ میرا دوست اس بچے کی پیدائش پر بہت خوش ہوا اور کچھ ایسا نظر آنے لگا کہ ان میاں بیوی کے درمیان پھیلی ہوئی کشیدگی اب مٹ جائے گی' لیکن بد قسمتی سے کچھ عرصہ بعد ہی ایک عجیب بھیانک حادثہ پیش آیا........

"یہ بچہ ایک سال کا ہو گیا تو اس کی دیکھ بھال کے لیے میرے دوست نے ایک نرس بھی ملازم رکھی۔ گزشتہ ماہ کا ذکر ہے۔ بچے کی نرس چند منٹ کے لیے اسے اکیلا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ بچے کے بلبلانے اور بُری طرح رونے کی آواز اس کے کان میں آئی۔ آواز سے نرس نے اندازہ کیا کہ بچہ خوفزدہ ہو کر چیخ رہا ہے۔ وہ بھاگی بھاگی کمرے میں گئی تو اس نے بچے کے بستر کے پاس اس کی ماں کو دیکھا' جو اپنے بچے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کی گردن پر کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بچے کی گردن پر زخم تھا جس میں سے سرخ سرخ خون کی پتلی سی دھار نکل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر نرس اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ دوڑ کر جائے اور میرے دوست کو اس حادثے کی خبر دے' مگر بچے کی ماں نے منت خوشامد کر کے نرس سے وعدہ لے لیا کہ وہ اس کا ذکر کسی سے ہرگز نہ کرے گی۔ اس کے بعد عورت نے نرس کو زبان بند رکھنے کے لیے پانچ پونڈ رقم کی رشوت بھی پیش کی..........

"بہرحال وقتی طور پر نرس خاموش رہی لیکن اس واقعے کا اثر اس کے دل و دماغ پر بُری طرح بیٹھ چکا تھا اور اس وقت سے اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی مالکہ کی نقل و حرکت پر ہر ممکن نظر رکھے گی اور بچے کو کسی بھی لمحے تنہا نہ چھوڑے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ نرس کو اس معصوم خوبصورت بچے سے بے حد محبت تھی اور یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کوئی ماں اتنی بے رحم ہو سکتی ہے کہ اپنی ہی کوکھ سے جنم لینے والے بچے کا خون پینے کو تیار ہو جائے۔ ادھر بچے کی ماں بھی دن رات نرس کی نگرانی کر رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ جونہی نرس کی نگاہ چوکے' وہ بچے کا خون چوسنے جا پہنچے' ویسے اپنی اپنی جگہ دونوں چپ چاپ اور خاموش تھیں۔ مسٹر ہومز یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے' حرف بہ حرف درست ہے اور خدا کے واسطے اس معاملے کو ہنسی مذاق میں نہ ٹال دیجئے گا۔ یہ ایک باپ اور ایک معصوم بچے کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس وقت تک میرے دوست کو کچھ علم نہ تھا کہ نرس کے سینے میں کیسا بھیانک راز پوشیدہ ہے۔ لیکن آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب یہ راز طشت ازبام ہو گیا۔ دراصل نرس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور وہ مزید ذہنی یا جسمانی دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہ تھی' چنانچہ اس نے بچے کے باپ کو ساری داستان سنا دی۔ یہ لرزہ خیز داستان سن کر وہ سخت حیران ہوا۔ کسی طرح اس کا ذہن یہ قبول کرنے کو آمادہ نہ تھا کہ کوئی ماں اپنے ہی لخت جگر کا خون پی سکتی ہے۔ اس نے نرس کو بری طرح ڈانٹا.........

"جس وقت میرا دوست نرس کو ڈانٹ رہا تھا' عین اسی وقت بچے کے کمرے سے چیخنے اور رونے کی آواز سنائی دی۔ نرس اور میرا دوست دونوں بیک وقت اس کمرے کی طرف دوڑے۔ مسٹر ہومز کیا آپ میرے دوست کی اس وقت کی حالت اور کیفیت کا اندازہ کریں گے' جب اس نے اپنے بچے کی گردن لہولہان دیکھی۔ اس کی بیوی بچے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے لب بچے کی گردن میں پیوست تھے۔ نرس اور اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے گردن اٹھائی تو یہ دیکھ کر میرا دوست دہشت سے تھرا گیا کہ بیوی کے لب بچے کے خون سے سرخ تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ بچے کے جسم سے کتنا خون چوس چکی تھی.........

"اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل لاحاصل ہے۔ صرف یہ سن لیجئے کہ میرا

دوست صدمے سے پاگل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ اس کی بیوی اپنے کمرے میں بند ہے اور کسی بھی وقت باہر نہیں نکلتی اور نہ وہ اس معاملے میں کچھ بتانے کے لیے تیار ہے۔ میرے دوست کو کسی نے بتایا ہے کہ اس کی بیوی ''ویمپائر ازم'' کا شکار ہو گئی۔ کیا آپ مہربانی کر کے مجھ سے ملاقات کے لیے کچھ وقت نکالیں گے؟ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ براہِ کرم مجھے چیس مین لیمبرلے کے پتے پر تار سے آگاہ فرمایئے۔ میں بہرحال صبح دس بجے تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ کا نادیدہ مشاق

رابرٹ فرگوسن۔''

اگلے روز صبح ٹھیک دس بجے فرگوسن ہمارے کمرے میں موجود تھا۔ گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ دھم سے کرسی پر گر کر ہانپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شرلک ہومز کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ ''آپ کا تار مجھے وقت پر مل گیا تھا' مسٹر ہومز۔ اور میں آپ سے یہ چھپانے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا کہ جو کچھ میں نے اپنے خط میں لکھا' وہ میری ہی آپ بیتی ہے۔''

''صحیح ہے۔'' ہومز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو پہلے ہی یہ بات صاف کر لینی چاہیے تھی۔ یوں بھی اپنا معاملہ اگر آپ بلاواسطہ پیش کریں تو زیادہ سہولت کا امکان ہے۔''

''مجھے اس کا شدید احساس ہے مسٹر ہومز۔'' فرگوسن نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ خود قیاس کر سکتے ہیں کہ میری ذہنی پراگندگی اور الجھن کا کیا حال ہو گا جبکہ معاملہ میری محبوب بیوی اور معصوم بچے کا ہو اور یہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس واقعے کی شہرت کا سبب میں خود بن جاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ میں پولیس کو رپورٹ کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔ آخر میں پولیس کو بتاتا بھی کیا؟ ظاہر ہے پولیس کسی ڈریکولا یا خوں آشام آسیبی وجود کو نہیں مانتی۔''

''یقیناً' ایسا ہے۔'' ہومز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن آپ حوصلہ رکھیں مسٹر فرگوسن۔ اس طرح گھبرانے یا پریشان ہونے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا۔

ن اور سکون سے بیٹھیے اور ایک بار پھر اپنی زبان سے تمام واقعات بیان کر
یے۔ کوئی معمولی سی بات بھی نہ چھوٹنے پائے۔ پھر میں آپ کو بتا سکوں گا کہ میں
ں تک اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر آپ کی مدد کرنے کے قابل ہوں۔ سب سے
مجھے یہ بتائیے کہ ابھی تک اس سلسلے میں خود آپ نے کیا قدم اٹھایا؟ کیا آپ کی
کی پہنچ بچے تک بدستور ہے؟"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بچے کی نگرانی نرس دن رات کرتی ہے اور اسے ایک
کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا جاتا۔ خود میری بیوی اس بھیانک
کے کھل جانے کے بعد ایسی بدحواس اور خوف زدہ ہوئی ہے کہ اس نے مستقل
ر خود کو اپنی خواب گاہ میں بند کر لیا ہے۔ وہ منہ سے بولتی ہے' نہ مجھے اپنی
ت دیکھنے دیتی ہے۔ میرے سوالوں اور پوچھ گچھ کا اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا'
کر میری طرف تکتی رہی' پھر رونے لگی اور دوڑ کر اپنی خواب گاہ میں گھس گئی'
سے دروازہ مقفل کر لیا۔ اس کے بعد سے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔
س نام کی ایک خادمہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ یہ عورت شادی سے پہلے بھی
کی خادمہ تھی۔ وہی میری بیوی کے لیے ناشتہ اور کھانا لے کر اس کے کمرے میں
ہے۔ اس کے علاوہ گھر کا کوئی فرد وہاں جانے کی جرأت نہیں کرتا اور سچ تو یہ
کہ خود مجھے اپنی بیوی سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خدا جانے وہ مجھ پر کب حملہ کر بیٹھے
میرا ہی خون پینے کو تیار ہو جائے۔ اگر میں خود اپنی آنکھوں سے اسے بچے کا خون
نہ دیکھتا تو کبھی اس بات پر یقین نہ کرتا.........."

"بہرحال بچہ اب بالکل محفوظ ہے۔" ہومز نے کہا۔ "نرس کا کیا نام ہے اور وہ
عورت ہے؟"

"مسز میسن......... اچھی' قابلِ اعتماد اور سمجھ دار عورت ہے وہ۔" فرگوسن نے
۔ "اس نے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ بچے کی ہمہ وقت نگرانی کرے گی۔
دراصل اپنی پہلی بیوی کے بچے جیک کے بارے میں زیادہ پریشان ہوں۔ اس کی یہ

سوتیلی ماں اس پر دو مرتبہ حملہ کر چکی ہے اور وہ لڑکا بے حد خوف زدہ ہے۔"

"کیا آپ کی بیوی نے جیک کا خون چوسنے کی بھی کوشش کی تھی؟"

"یہ میرے علم میں نہیں۔" فرگوسن نے کہا۔ "جیک کے گلے پر کسی قسم کا زخم نہیں پایا گیا۔ البتہ دو مرتبہ اس عورت نے جیک کو بُری طرح پیٹا تھا۔ حالانکہ وہ بیچارہ اپاہج ہے۔"

اپنے اپاہج لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے فرگوسن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہومز تھوڑی دیر تک اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا۔

"اس وقت آپ کے گھر میں کل کتنے افراد ہیں؟"

"دیکھئے ابھی بتاتا ہوں۔" فرگوسن نے جواب دیا۔ "دو نوکر گھر اور باہر کا کام کرنے کے لیے۔ انہیں ملازم ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری۔ اصطبل کی نگہداشت کرنے والا سائیں اور کوچبان، اس کا نام مائیکل ہے۔ یہ شخص گھر ہی میں سویا کرتا ہے۔ میری بیوی' میں خود اور میرا لڑکا جیک جو پہلی بیوی سے ہے۔ موجودہ بیوی کی پرانی خادمہ ڈولرس اور نرس مسز میسن یہ کل آٹھ افراد ہوئے۔"

"ٹھیک......... اب ایک ذاتی نوعیت کا سوال کروں گا مسٹر فرگوسن۔ شادی سے پہلے آپ اپنی موجودہ بیوی کے بارے میں کیا کچھ جانتے تھے؟"

"کچھ زیادہ نہیں......... واقعہ یہ ہے کہ میری اس سے اور اس کے باپ سے صرف چند ہفتوں کی شناسائی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ اچھے لوگ ہیں اور جونہی میں نے شادی کا پیام دیا اس عورت نے فوراً" رضامندی ظاہر کر دی۔ میں سچ کہوں کہ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے اور کچھ ایسی حالت میری بھی تھی۔"

"آپ کی بیوی کی خادمہ ڈولرس' اُس کے ساتھ کب سے ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ کئی برس سے میری بیوی کے ساتھ ہے۔"

"خوب......... خوب......... اس کا مطلب یہ ہوا کہ خادمہ ڈولرس' آپ کی بیوی کے کردار کے بارے میں آپ سے کہیں زیادہ مستند معلومات رکھتی ہو گی؟" ہومز

نے پوچھا۔

"بے شک۔" فرگوسن نے اقرار کیا۔ "یقیناً" اسے میری بیوی کے بارے میں
ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو شاید ابھی تک میرے علم میں نہیں آئیں۔"

ہومز نے یادداشت کے لیے کاغذ پر کچھ لکھا۔ پھر چند لمحے غور کرنے کے بعد
بولا..........

"میرا خیال ہے مسٹر فرگوسن' اس عجیب و غریب معاملے کی تفتیش کے لیے مجھے
آپ کے مکان تک جانا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں بعض ذاتی نوعیت کی باتیں ایسی ہیں
جو وہیں چل کر معلوم ہوں گی۔ فی الحال یہ بھی اچھا ہے کہ آپ کی بیوی اپنے کمرے
میں بند ہے اور باہر نہیں نکلتی۔ لہٰذا اسے ہماری آمد سے کوئی پریشانی لاحق نہ ہو گی۔
ویسے بھی ہم قصبے کی سرائے میں قیام کریں گے۔"

فرگوسن نے اطمینان کا سانس لیا۔

"مَیں آپ کا اور ڈاکٹر واٹسن' دونوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، مسٹر ہومز۔"

"خدا کرے میں آپ کی توقعات پر پورا اُتر سکوں۔" ہومز نے کہا۔ "ہاں ایک
بات کی مزید وضاحت چاہوں گا۔ آپ نے اپنے خط میں جو حالات تحریر کیے ہیں' اس
سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی بیوی نے اپنے بچے اور جیک دونوں پر حملہ کیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن ان حملوں کی نوعیت مختلف تھی؟ اس نے اپنے بچے کا خون پینے کی
کوشش کی جبکہ اپاہج جیک کو صرف چھڑی سے مارنے پر اکتفا کیا۔ کیا آپ کی بیوی
نے اس کی کوئی معقول وجہ بیان کی؟"

"مطلق نہیں......... صرف اتنا کہا کہ اسے اس لڑکے سے شدید نفرت ہے۔
وہ حد درجہ حساس اور مغلوب الغضب عورت ہے۔ جیک کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں
میں خون اتر آتا ہے' حالانکہ مجھ سے اس کی محبت بھی بڑی شدید ہے۔"

"جیساکہ آپ نے بتایا ہے' جیک کی عمر اس وقت پندرہ برس کی ہے۔ ممکن

ہے اس نے اپنی سوتیلی ماں کے خلاف اپنے دل و دماغ میں کسی قسم کا محاذ قائم کر رکھا ہو؟ بعض اوقات اپاہج بچے شدید نوعیت کے احساس کمتری کا شکار ہو کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جو ان کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارنے میں خاصا کام کرتی ہیں۔"

"میں نے اس رخ پر بھی غور کیا تھا۔ مسٹر ہومز۔" فرگوسن نے جواب دیا۔ "لیکن جیک کے دل میں اپنی سوتیلی ماں کے خلاف نفرت یا حقارت کا کوئی شائبہ میں نے محسوس نہیں کیا۔"

"سوتیلی ماں کبھی جیک کے ساتھ پیار محبت سے بھی پیش آئی؟"

فرگوسن نے ایک لحظہ تامل کے بعد کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ جیک نے کبھی اسے محبت کی نظر سے دیکھا۔"

"اس کے باوجود آپ مُصر ہیں کہ جیک کے دل میں اپنی سوتیلی والدہ کے خلاف نفرت کے جذباب کبھی پیدا نہیں ہوئے؟"

"میرا مطلب یہ تھا کہ جیک نے ان جذبات کا عملاً" کبھی اظہار نہیں کیا۔"

"بہت خوب۔ میرا خیال ہے آپ کا یہ لڑکا نہایت دلچسپ کریکٹر کا مالک ہے۔" ہومز نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا' اب ایک اور بات میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بتائیے آپ کی بیوی نے اپنے معصوم بچے اور جیک پر جو حملے کیے' کیا وہ ایک ہی دن ہوئے یا وقفوں سے؟"

"دیکھئے میں عرض کرتا ہوں۔" فرگوسن نے یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "پہلی بار جب میری بیوی پر دیوانگی کا دورہ پڑا تو اس نے دونوں پر حملہ کیا تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے جیسے کوئی اور قوت میری بیوی کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ جس بچے کی گردن میں اس نے دانت گاڑے تھے وہ اس کا اپنا بچہ ہے۔ دوسری بار اسے دورہ پڑا تو وہ جیک پر پل پڑی اور مار مار کر اسے ادھ مُوا کر دیا۔ مسز میسن کا بیان ہے کہ اس مرتبہ اس نے اپنے بچے پر حملہ نہیں

تھا۔"

"تعجب ہے۔" ہومز نے آنکھیں بند کر کے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "یوں معاملات خاصے پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مسٹر ہومز۔"

"یقیناً" آپ نہیں سمجھے ہوں گے۔" ہومز نے جواب دیا۔ "بہرحال میں نے اپنے طور پر چند نتائج اخذ کئے ہیں اور ان کی تصدیق صرف موقعِ واردات پر پہنچ کر ہی ہو سکتی ہے۔ ٹھیک دو بجے میں اور ڈاکٹر والٹن وکٹوریا سٹیشن پر آپ سے ملیں گے۔"

یہ نومبر کی کہر آلود، سخت سرد اور نہایت ناخوشگوار شام تھی، جب ہم نے لیمبرلے کی سرائے میں اپنا مختصر سا سامان رکھا اور فرگوسن کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ ایک عالی شان اور بے حد قدیم عمارت تھی جس کے بعض حصوں کی غالباً حال ہی میں مرمت کرائی گئی تھی۔ اس کی دیواروں، برجیوں اور چمنیوں کا رنگ صدیوں کی کائیاں جم جم کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ عمارت کے اردگرد اونچے اونچے گھنے درخت کھڑے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں سب بوسیدہ نظر آتی تھیں۔ رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی اور سناٹے میں یہ عظیم الشان عمارت واقعی کاؤنٹ ڈریکولا کا آسیبی محل دکھائی دے رہی تھی۔ نہیں کہہ سکتا کہ ہومز کی اندرونی کیفیت کیا تھی، مگر میں اپنا حال سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ ڈراؤنا ماحول دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اگر خود فرگوسن ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اس منحوس عمارت کے اندر داخل ہونے ہی سے انکار کر دیتا۔

عمارت کے مرکزی حصے میں ایک خاصا بڑا ہال کمرہ تھا۔ فرگوسن ہمیں اس کمرے میں لے گیا۔ ایک وسیع و عریض آتش دان میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ فضا خاصی گرم تھی اور یہیں آتش دان کے اوپر ایک آہنی تختی نصب تھی۔ اس تختی پر لکھا تھا کہ یہ عمارت 1670ء میں تعمیر کی گئی۔ گویا اس وقت تک اس پر ڈھائی سو برس گزر چکے تھے۔ ایک اونچی شاہانہ انداز کی لیکن چرچراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر میں نے

کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ دیواروں پر سے جا بجا پلستر اکھڑا ہوا تھا اور بوسیدہ اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ پرانی واٹر کلر تصویروں کے علاوہ دیواروں پر جنوبی امریکہ میں پائے جانے والے وحشی اور جنگلی قبائل کے ہتھیاروں کی نمائش بھی کی گئی تھی۔ ان میں خنجر تھے' کلہاڑیاں تھیں۔ زہر میں بجھے ہوئے چھوٹے بڑے تیر تھے اور نہ جانے کون کون سے زمانۂ قدیم کے ہتھیار تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ چیزیں شرلک ہومز کی حد درجہ دلچسپی کا باعث بن رہی ہیں۔ وہ اٹھ کر دیوار کے پاس گیا اور ان ہتھیاروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ واپس اپنی کرسی کی طرف آیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کے آثار ابھرتے پائے۔

یکایک ایک چھوٹا سا خوب صورت سپینل کتا کمرے کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی ٹوکری میں سے برآمد ہوا اور سست چال چلتا' دم ہلاتا اپنے آقا فرگوسن کی جانب آیا۔ کتے کو چلنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی' لیکن اپنی فطرت کے مطابق وہ مالک کی قدم بوسی کرنے کے لیے مجبور تھا۔ اس کی پچھلی ٹانگیں لرز رہی تھیں' لڑکھڑا رہی تھیں اور دم زمین کو چھو رہی تھی۔ ہومز نے کتے کو دیکھا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''آہا...... مسٹر فرگوسن' آپ کا کتا تو بہت پیارا ہے' لیکن یہ کچھ بیمار سا لگ رہا ہے۔''

فرگوسن نے ہاتھ چاٹتے ہوئے کتے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

''آپ کا قیاس درست ہے مسٹر ہومز' ابھی چند ماہ قبل یہ کتا بالکل تندرست اور چاق چوبند تھا، لیکن نہ جانے دیکھتے دیکھتے اسے کیا بیماری لاحق ہو گئی' چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ میرا خیال ہے اس نسل کے کتے اکثر فالج کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال میں اسے بہت جلد ہسپتال لے جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ اس کا نام کارلو ہے اور یہ گھر کے ہر فرد سے بڑی محبت کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر فرگوسن نے پیار سے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے دیکھا' کتا عجیب حسرت آمیز نگاہوں سے اپنے آقا کی

طرف تک رہا ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو' لیکن کہہ نہ سکتا ہو اور اپنی اس مجبوری سے خوب آگاہ بھی ہو۔ اس کا جسم بری طرح تھرتھرانے لگا۔ پھر اس نے باری باری میری اور ہومز کی جانب دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا یہ انداز ایسا تھا جیسے وہ ہماری گفتگو کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ ہم اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

ہومز نے جھک کر کتے کا معائنہ کیا' پھر فرگوسن سے پوچھا۔

"کیا اس پر فالج نے ایک دم حملہ کیا یا آہستہ آہستہ علامات ظاہر ہوئیں تھیں۔"

"ایک دم جناب، بالکل ایک دم۔ دن بھر یہ ٹھیک ٹھاک رہا۔ گھر میں ادھر اُدھر بھاگتا دوڑتا رہا۔ شام کو سو گیا۔ اگلے روز دیکھا تو بری طرح نڈھال تھا۔"

"اس حادثے کو کتنی مدت ہوئی؟"

"غالباً" چار ماہ ہو گئے ہوں گے۔"

"آہ........" ہومز کے منہ سے کلمۂ تحیر نکلا۔

"بہت دلچسپ........ نہایت حیران کُن........" فرگوسن نے حیرت سے ہومز کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا اس کتے کی بیماری کا کوئی تعلق اس حادثے سے ہے جو حال ہی میں ہمارے گھر میں پیش آیا ہے؟" فرگوسن نے بے تابی سے کہا۔

ہومز نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور کہا۔

"میرا خیال ہے مسٹر فرگوسن' اس معاملے میں آپ کو مزید صدمہ برداشت کرنا ہو گا۔ حالات جس حد تک میرے سامنے واضح ہو رہے ہیں' ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ معاملے کی صورت دراصل وہ نہیں ہے' جو بظاہر دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال میں آپ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ فی الحال میں کچھ بتانے سے معذور ہوں۔ ابھی میں اپنے ایک دو اندازوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ پھر میں بلا کم و کاست سارا راز افشاں کر دوں گا۔"

"بہت بہتر مسٹر ہومز۔ میں اب ہر صدمہ برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو دیکھ آؤں۔ شاید اس عرصے میں اس کے حال احوال میں کوئی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہو۔ اس کا کمرہ اوپر کی منزل میں ہے۔ میں ابھی واپس آیا۔"

وہ چند منٹ تک غیر حاضر رہا۔ اس اثنا میں ہومز' دیواروں پر لگے ہوئے ان قدیم ہتھیاروں کی طرف پھر متوجہ ہو گیا۔ اس نے زہر میں بجھے ہوئے ننھے ننھے تیروں کو خاص طور سے دیکھا' لیکن ہاتھ نہیں لگایا۔ میں چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اتنے میں فرگوسن واپس آیا۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ معاملہ خوشگوار ہونے کی بجائے کچھ اور بگڑ گیا ہے۔ فرگوسن کے عقب میں ایک لمبے قد اور صحت مند جسم کی نوجوان لڑکی بھی چلی آ رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر رنج و اندوہ کے تاریک سائے رقص کر رہے تھے۔

"یہ میری بیوی کی خاص خادمہ ڈولرس ہے۔" فرگوسن نے بتایا۔ میں نے اور ہومز نے گردن کے اشارے سے یہ تعارف قبول کیا۔ ڈولرس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مالکہ بے حد بیمار ہیں جناب......... وہ نہ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں......... آج انہوں نے چائے بھی نہیں پی......... نہ وہ بولتی ہیں......... بس روئے جاتی ہیں۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی ہیں......... اگر کسی ڈاکٹر کو جلد نہ بلایا گیا تو خدشہ ہے کہ وہ........." اس سے آگے ڈولرس کچھ نہ کہہ سکی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ فرگوسن نے ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میری خدمات حاضر ہیں فرگوسن۔"

ڈولرس نے حیرت اور خوشی سے مجھے دیکھا۔ فرگوسن نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ڈاکٹر واٹسن کو اوپر لے جاؤ ڈولرس۔"

لکڑیوں کا بنا ہوا بوسیدہ زینہ اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ میں ڈولرس کے پیچھے پیچھے

میں نے دیکھا فرطِ جذبات سے نوجوان خادمہ کا بُرا حال تھا۔ اس کے منہ سے
صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔ لمبی غلام گردش طے کرنے کے بعد خادمہ
کمرے کے بند دروازے کے پاس رکی۔ اس نے اپنی جیب سے چابی نکال کر
وازے کے سوراخ میں ڈالی' ایک لمحے کے بعد دروازہ کھلا' خادمہ نے مجھے اندر
نے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد
مہ نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی مسہری پر کمبل
ڑھے ایک بے حد خوب صورت عورت لیٹی تھی۔ اس کا جسم بے حس و حرکت تھا
ر آنکھیں آدھی بند تھیں' جیسے نیم بے ہوشی کے عالم میں ہو' لیکن میرے قدموں
ی آہٹ پا کر عورت کے بدن میں جنبش ہوئی۔ اس نے گردن اٹھائی' مجھے دیکھا اور
یا" یہ محسوس کر کے کہ کمرے میں آنے والا اس کے شوہر کے بجائے کوئی اور ہے'
ے پر سر رکھ کر چھت کی طرف گھورنے لگی۔ میں نے قریب پہنچ کر اسے بتایا کہ میں
یک ڈاکٹر ہوں اور اس کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوں۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا'
موش لیٹی رہی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی' پھر درجۂ حرارت کا جائزہ لیا۔ نبض اور
رجۂ حرارت دونوں تیز تھے' تاہم یہ اندازہ کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی
ہ عورت کی جسمانی اور اعصابی حالت بہتر' لیکن ذہن پراگندہ اور ابتر ہے۔ خادمہ
ےاس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر واٹسن' یہ دو تین دن سے اسی طرح لیٹی ہیں اور انہوں نے کچھ کھایا
ے نہ پیا ہے۔ اگر یہی کیفیت رہی' تو شاید یہ چل بسیں......... انہیں بچا لیجیے
کٹر۔"

عورت نے دفعتہً اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ بلاشبہ
حسین تھی۔ اس نے بھاری آواز اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر' میرا شوہر کہاں
ے؟"

"نیچے ہال کمرے میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ آپ کو دیکھنے آیا تو تھا۔"

"میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی......... میں اس کی صورت ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی۔" عورت نے زور دے کر کہا۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں چھت پر گاڑ دیں اور ہولے سے بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "شیطان......... بد بخت......... ظالم......... سمجھ میں نہیں آتا مَیں اس درندے کے ساتھ کیا سلوک کروں......... وہ تو شیطان ہے شیطان.........."

"محترمہ کیا آپ کی اس ذہنی اُلجھن کو دور کرنے میں کوئی حصہ لے سکتا ہوں!" مَیں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں........." وہ چیخی......... "تم بھلا میری کیا مدد کرو گے؟ کوئی شخص میرے کام نہیں آ سکتا۔ بس سارا معاملہ ختم ہو چکا......... اب کچھ نہیں کیا سکتا......... سب تباہ ہو چکا......... بربادی اس گھر کا مقدر ہے......... سمجھے؟ اگر واقعی سچے دل سے میری مدد کرنا چاہتے ہو' تو جو میں کہوں' وہ کرو۔ کرو گے؟ لیکن آہ......... تم کیا کرو گے......... اب باقی ہی کیا رہا ہے........."

وہ بڑبڑاتی رہی جیسے اس پر ہذیان یا ہیجان کی شدید کیفیت طاری ہو۔ اس کی آنکھوں سے بھی وحشت کا اظہار ہوتا تھا اور ہونٹوں کے کناروں پر جھاگ اُبھر آیا تھا۔ یہ پاگل پن کی صریح علامت ہے۔ کیا وہ اپنے شوہر کو شیطان' بدبخت اور ظالم کے خطابات دے رہی تھی یا کسی اور کو؟

"محترمہ' ذرا ہوش میں آیئے۔" مَیں نے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کا شوہر بے چارہ تو فرشتہ سیرت آدمی ہے۔ مَیں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو آپ کو دیوانہ وار چاہتا ہے۔ گزشتہ دنوں اس مکان میں جو ہولناک واقعات رونما ہوئے' وہ ان پر خاصا پریشان ہے۔ اِدھر آپ نے ایسی حالت بنا رکھی ہے۔"

عورت مسکرائی اور اس کے سفید سفید دانت چمکتے دکھائی دیئے۔

"ہونہہ۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے......... مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے......... بے شک میں جانتی ہوں لیکن کان کھول کر سن لو ڈاکٹر' مجھے اس سے ہرگز محبت

...... مطلق نہیں...... ہاں پہلے میں بھی اسے چاہتی تھی' لیکن اس نے
میری محبت کی قدر ہی نہ کی...... میں نے اپنا سب کچھ اسے دے دیا...... اس
کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ...... کہ......"

"اسے خود ان باتوں پر رنج ہے محترمہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن مصیبت یہ ہے
کہ وہ کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہے۔"

"غلط فہمی؟ کیا میرے بارے میں؟ اس کا فرض تھا کہ وہ الٹی سیدھی باتیں
سوچنے کے بجائے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا فرض تھا کہ مجھے
اعتماد میں لیتا۔"

"بہرحال جو ہونا تھا' ہو گیا۔ اب آپ اُسے یہاں آنے کی اجازت دے دیں۔"

"ہرگز نہیں۔" عورت نے عزمِ مصمم سے کہا۔ "ڈاکٹر واٹسن' تمہیں علم نہیں
وہ مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔ اس نے میرے بارے میں ایسے الفاظ میرے منہ پر کہے ہیں
جو کوئی شوہر' چاہت کا دعویٰ کرنے والا ، اپنی بیوی سے نہیں کرتا...... جاؤ اس
سے کہہ دو کہ وہ مجھے دوبارہ اپنی صورت نہ دکھائے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ
دے۔ میں اس سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کرتی ہوں اور وہ یہ کہ میرا بچہ مجھ تک
پہنچا دیا جائے...... یہ میرا حق ہے۔ ایک ماں کا حق ہے...... میں اپنا بچہ چاہتی
ہوں...... بس یہی ایک پیغام ہے جو میں تمہاری معرفت اس تک بھیجنا چاہتی ہوں۔
اگر تم واقعی میری مدد کرنا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ میرا بچہ مجھے واپس دے دے۔
اس سے زیادہ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

میں مایوس ہو کر نیچے چلا آیا۔ فرگوسن اور شرلک ہومز آتش دان کے قریب
بیٹھے تھے۔ میں نے حرف بہ حرف وہ تمام باتیں اس کے گوش گزار کر دیں جو اس کی
بیوی سے ہوئی تھیں۔ جب میں نے بچے کو بھیجنے کا پیغام دیا' تو وہ مضطرب ہو کر بولا۔

"یہ اچھی کہی۔ میں قیامت تک بچے کو اس ڈائن کے پاس نہ بھیجوں گا۔ بھلا
میں وہ خونیں نظارہ کیسے فراموش کر دوں۔ جب میں نے اپنی بیوی کو بچے کا خون چاٹتے

دیکھا تھا۔ خدا کی پناہ' اب بھی وہ سین نظروں کے سامنے آتا ہے تو کلیجہ اچھل کر حلق میں آ جاتا ہے۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے' تب بھی میں اپنے معصوم بچے کو اس چڑیل کے حوالے نہ کروں گا۔ کہہ دیجئے اس سے کہ بچہ مسز میسن کے پاس ہر طرح خیریت سے اور محفوظ ہے۔"

اتنے میں ایک خادمہ چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھے کمرے میں آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چودہ پندرہ سال کا لڑکا بیساکھیوں کے سہارے چل کر اندر آیا۔ وہ بے حد نحیف و نزار تھا۔ چہرے کا رنگ پیلا' آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی جن سے تجسس' چالاکی اور ہوشیاری ٹپکتی تھی۔ اپنے باپ کو دیکھ کر وہ خوش ہوا اور دونوں بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ فرگوسن نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔ "ان سے ملو بیٹے' یہ ہیں ڈاکٹر واٹسن میرے پرانے دوست اور یہ ہیں مسٹر شرلک ہومز۔ یہ آج ہی لندن سے میرے ساتھ آئے ہیں۔" پھر اس نے ہمیں بتایا کہ یہ اس کا لڑکا جیک ہے۔ ہومز کا نام سن کر لڑکے نے گردن موڑ کر میرے دوست پر نظریں گاڑ دیں۔ میں نے اس کے زرد چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار ابھرتے پائے۔ چند لمحے گزر جانے کے بعد اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"ڈیڈی' کیا یہ وہی شرلک ہومز ہیں......... مشہور جاسوس.........؟"

"ہاں ہاں بیٹے' یہ وہی ہیں۔" فرگوسن نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم انہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔"

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا اور برابر شرلک ہومز کو نفرت بھری نگاہوں سے گھورتا رہا۔ دفعتہً ہومز نے کہا۔

"جیک سے تو ملاقات ہو گئی مسٹر فرگوسن' اب براہِ کرم اپنے دوسرے بچے سے ملوایئے۔ میں اسے دیکھنے کا بے حد مشتاق ہوں۔"

"جیک جاؤ اور مسز میسن سے کہو کہ بچے کو یہاں لے آئے۔"

لڑکے نے سخت ناگواری سے اپنے باپ کو دیکھا او کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لمبے قد کی ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ واپس آیا جس کی گود میں ایک سال کا نہایت خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد حسین اور بال سنہری تھے۔ فرگوسن نے اسے بڑی محبت اور گرمجوشی سے گود میں لے کر چوما' پھر اس نے بچے کی قمیض کا کالر ہٹا کر اس کی ننھی سی گردن پر زخم کا نشان دکھایا۔ یہ نشان عین گردن کے وسط میں تھا۔ یکایک میری نگاہ بچے سے ہٹ کر ہومز پر پڑی اور میں حیران رہ گیا کیونکہ وہ اس بچے اور ہم لوگوں کی موجودگی سے بالکل بے خبر پلک جھپکے بغیر کمرے کے انتہائی پرلی جانب کسی نادیدہ شے کو گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور جاننے کی کوشش کی کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے لیکن ناکام رہا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ وہ اس کھڑکی پر نگاہ جمائے ہوئے ہے جو باغ کی طرف کھلتی ہے۔ اس کھڑکی کا ایک پٹ نصف کھلا تھا لیکن اس طرح کہ باہر کا منظر مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہومز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر اس کی نگاہیں کھڑکی سے ہٹ کر فرگوسن کے معصوم بچے پر پلٹ آئیں۔ کچھ کہے بغیر ہومز نے بچے کی گردن کے زخم کا معائنہ کیا۔ آخر اس نے مسز میسن سے کہا۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو' تو میں چند لمحے علیحدگی میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

نرس نے نظروں ہی نظروں میں فرگوسن سے اجازت لی۔ ہومز' نرس کے ساتھ کمرے کے دوسری جانب کچھ فاصلے پر چلا گیا اور دونوں مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے صرف ہومز کے یہ الفاظ سنائی دیئے وہ نرس سے کہہ رہا تھا۔ "گھبرایئے نہیں' یہ مسئلہ آج ہی حل ہوا چاہتا ہے' اب آپ بچے کو لے کر جا سکتی ہیں۔"

اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہومز نے جیک کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب بھی خوف کے آثار موجود تھے۔ ہومز کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر لڑکا اور گھبرایا اور نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتہ" ہومز نے اس سے پوچھا۔

"جیک' میرا خیال ہے تم مسز میسن کو پسند نہیں کرتے؟"

جیک کے بجائے اس کے باپ نے جواب دیا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے مسٹر ہومز۔ جب سے اس کی ماں مری ہے' اسے کوئی عورت اچھی نہیں لگتی۔ بدقسمتی سے اس کی سوتیلی ماں نے بھی اس کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کی۔" اس نے جیک کو دیکھا اور پیار سے کہا۔ "اب جاؤ بیٹے اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" لڑکا چلا گیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر شرلک ہومز نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فرگوسن' میرا خیال ہے سارا مسئلہ حل ہو چکا ہے اور اب ہمارے یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ براہِ کرم یہ بتائیے کہ رات کو کون سی ٹرین لندن جاتی ہے۔"

فرگوسن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک منٹ تک اس کا منہ سوالیہ انداز میں کھلا رہا۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "خدا رحم کرے مسٹر ہومز' آپ میرے صبر کا کب تک امتحان لیں گے۔ جلدی سے بتائیے یہ مسئلہ آپ نے کیونکر حل کیا اور کیا واقعی میری بیوی ڈریکولا کے خاندان سے ہے؟"

ہومز نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی سب کچھ معلوم ہوا جاتا ہے۔ مسٹر فرگوسن' میں اس وقت چند منٹ کے لیے آپ کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے واٹسن' یہ ملاقات تم کرا سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔ بڑے شوق سے۔" میں نے کہا۔ "آؤ اوپر چلو۔ میں خادمہ ڈولرس سے کہوں گا اور وہ دروازہ کھول دے گی۔"

"بہت خوب' لیکن میں مسٹر فرگوسن کو بھی اپنے ساتھ اوپر لے جانا چاہتا ہوں۔" ہومز نے کہا۔

"مجھے؟" فرگوسن چلایا۔ "مجھے کیوں؟ وہ تو میری شکل سے بیزار ہے۔ ابھی ابھی آپ نے ڈاکٹر واٹسن کی زبانی سنا ہے کہ وہ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"میرا خیال ہے وہ مسٹر فرگوسن کی شکل دیکھنے کو تیار ہو جائے گی۔" ہومز نے

ا۔ پھر اس نے اپنی نوٹ بک سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اس پر پنسل سے کچھ لکھا ور لپیٹ کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "واٹسن' چونکہ تم مسز فرگوسن سے قات کر چکے ہو' اس لیے ذرا تکلیف کر کے یہ پرچہ ان تک پہنچا دو۔"

میں نے وہ کاغذ مٹھی میں دبایا۔ ایک بار پھر لکڑی کا بوسیدہ زینہ میرے قدموں تلے چرچرا رہا تھا۔ خادمہ ڈولرس کمرے میں موجود تھی۔ میرے دستک دیتے ہی باہر لی' میں نے وہ رقعہ اسے دے دیا کہ اپنی مالکہ کے حوالے کر دے۔ ایک منٹ بعد کمرے میں سے مسز فرگوسن کے خوشی سے چلانے اور بولنے کی آواز سنائی دی۔ وسرے ہی لمحے ڈولرس نے آن کر مجھ سے کہا۔

"مالکہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر اور مسٹر شرلک ہومز سے ملنے کے لیے تیار یں۔ انہیں فوراً" یہاں لے آیئے۔"

فرگوسن کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ابھی چند لمحے پیشتر جو عورت اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھی' وہ ہومز کا رقعہ پڑھنے کے فوراً" بعد ملنے کے لیے تیار ہو گئی۔ شرلک ہومز اور فرگوسن چپ چاپ کمرے میں داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عورت نے صرف ایک بار گردن اٹھا کر اپنے شوہر کو دیکھا اور کروٹ بدل لی۔ ہومز نے فرگوسن سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں' مَیں مصروف آدمی ہوں اور میرا وقت قیمتی ہے۔ کیس حل ہو چکا ہے اور میں رات کی ٹرین سے واٹسن سمیت لندن واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن......... لیکن........" فرگوسن نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیس کیوں کر حل ہو گیا جبکہ بظاہر بات وہیں کی وہیں ہے۔ ہومز نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور اپنی بات جاری رکھی۔

"میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں مسٹر فرگوسن۔ آپ کی بیوی نہایت صحیح دماغ' ذہین اور آپ سے محبت کرنے والی ہے۔ اسے اپنے بچے سے بھی والہانہ حد تک پیار ہے......... اس کے ساتھ ساتھ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس عورت

سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ بلاشبہ آپ نے اس پر اعتماد نہیں کیا اور سوچے سمجھے بغیر اس سے بدظن ہو گئے۔"

فرگوسن شدتِ جذبات اور تحیر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر ہومز، اگر آپ اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دیں تو میں ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام۔"

"میں ضرور ثابت کروں گا۔" ہومز نے مسکرا کر کہا۔ "معاملہ اس قدر سیدھا اور صاف تھا کہ میں ابتدا ہی میں اس کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ آپ کی بیوی بے گناہ ہے، لیکن اس وقت آپ کو سمجھانا بے کار تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے ایک دو قیاسات کی تصدیق بھی چاہتا تھا اور وہ جبھی ممکن تھا کہ میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوتا۔ خدا کا شکر کہ یہاں آتے ہی میرے قیاسات نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور شک و شبے کا ہلکا سا کانٹا بھی میرے دماغ سے نکل گیا۔ آپ نے اپنے خط میں ویمپائر، خوں آشام ویمپائر کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ آیا اس دورِ جدید میں اس کا وجود ہے؟ یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ ڈریکولا یا اور اس قبیل کے خبیث اور چڑیلیں صرف قصے کہانیوں میں پائی جاتی ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں ان کا وجود پہلے کبھی تھا، نہ اب ہے، لہٰذا اس رخ پر دماغ کھپانا بے سود تھا۔ دوسری طرف آپ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ خود اس عورت کو بچے پر جھکا پایا اور جب اس نے گردن اٹھائی تو عورت کے لب بچے کے خون سے سرخ تھے۔ بچے کی گردن پر زخم کا نشان بھی شہادت دیتا ہے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا، درست تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا میرے لیے دشوار نہ تھا کہ اس واردات کے پسِ پردہ کوئی ذہین مجرم ہے جو یہ ڈرامہ رچا کر میاں بیوی کے درمیان نفرت اور عداوت کی ایسی خلیج پیدا کرنا چاہتا ہے جس کا اختتام ہمیشہ کی علیحدگی پر ہو۔ یہ خونیں نظارہ دیکھ کر آپ نے سمجھ لیا کہ آپ کی بیوی کوئی خوں آشام بلا ہے جو اپنے ہی بچے کا خون چوس رہی ہے۔ کاش آپ یہ غور کرنے کی زحمت گوارا کرتے کہ بعض اوقات زہر خارج کرنے کے لیے بھی زخم پر

ہونٹ رکھ کر خون چوسا جاتا ہے‘ تاکہ زخمی کی زندگی بچائی جا سکے اور اگرچہ ایسا کرنے
میں خون چوسنے والے کی ہلاکت کا خطرہ بھی ہوتا ہے لیکن محبت اور عشق کے زیرِ اثر
یہ خطرہ برداشت کر لیا جاتا ہے۔“

فرگوسن کے چہرے پر ایک رنگ آتا‘ ایک جاتا تھا۔ اس کے ہونٹ بری طرح
لرز رہے تھے۔

”زخمی......... زہر.........“ وہ بڑبڑایا۔

”جی ہاں۔ آپ کے مکان میں داخل ہوتے ہی ہال کمرے میں سجے ہوئے جنوبی
امریکہ کے وحشی قبائل کے قدیم ہتھیار میں نے دیکھے اور سارا قصہ سمجھ میں آ گیا۔“
ہومز نے کہا۔ ”میرے ذہن میں پہلے سے یہ بات تھی کہ اس کیس میں چالاک مجرم
نے زہر استعمال کیا ہے اور بچے کی گردن میں کوئی ایسی چیز چبھوئی ہے جو زہر میں بجھی
ہوئی ہو گی......... لیکن وہ کیا چیز تھی؟ اس کا عقدہ ہال کمرے کی دیواروں پر ایک نظر
ڈالتے ہی وا ہو گیا۔ زہر میں بجھے ہوئے ننھے ننھے تیر۔“

”خدا کی پناہ!“ فرگوسن چلایا۔ ”اس طرف تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔“

”میں نے سوچا کہ اگر زہر میں بجھا ہوا یہ تیر بچے کی گردن میں چبھو دیا جائے‘ تو
کچھ عرصے بعد اِس سے لازماً بچے کی موت واقع ہو جائے گی۔ بشرطیکہ زخم سے یہ زہر
نکالا نہ گیا اور زہر فوری طور پر نکالنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ایسا فرد زخم سے زہر
چوس لے جسے بچے سے والہانہ محبت ہو۔ ظاہر ہے یہ جان جوکھوں کا کام بچے کی ماں
ہی کر سکتی ہے۔“

فرگوسن دم بخود آنکھیں پھاڑے ہومز کی تقریر سن رہا تھا۔

”اس کے بعد میں نے آپ کے پالتو سپینئل کو دیکھا جسے بقول آپ کے فالج نے
رات رات میں اپاہج کر دیا۔ فرض کیجئے اگر میں زہر میں بجھے ہوئے ان تیروں کا امتحان
کرنا چاہوں کہ ان میں زہر کی تاثیر ابھی باقی ہے یا ختم ہو گئی تو میں کیا کروں گا؟ یقیناً
یہ تیر کسی جاندار کے جسم میں چبھو کر دیکھوں گا کہ زہر اثر کرتا ہے یا نہیں۔ اس

مقصد کے لیے گھر میں پلا ہوا کتا میرے لیے تجربے کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ مَیں اپنے اصل پروگرام کو عملی جامہ پہنانے سے چار ماہ قبل ہی ایک زہریلا تیر کتے کے جسم میں چبھو دیتا ہوں اور یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ زہر نے اپنی مہلک تاثیر ختم نہیں کی ہے۔ کہئے کچھ سمجھ میں آیا۔ مسٹر فرگوسن!"

بیچارے فرگوسن نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"اب آگے چلئے۔" ہومز نے کہنا شروع کیا۔ "آپ کی بیوی کو احساس تھا کہ گھر میں ایک فرد ایسا ہے جو آپ کے اس ایک سالہ حسین صحت مند بچے کو بالکل پسند نہیں کرتا اور احساسِ کمتری کا شکار ہونے کے باعث' اس بچے کو ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ آخر ایک روز اس نے مجرم کو دیکھ لیا۔ وہ بچے کی گردن میں زہر آلود تیر چبھو کر بھاگ گیا......... بچے کی گردن لہو لہان ہو گئی۔ ماں کو علم تھا کہ زہر نکالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ چنانچہ اس نے زخم سے زہر چوس لیا۔ اگر وہ حاضر دماغی سے کام لے کر ایسا نہ کرتی تو یقین کیجئے آپ کے بچے کا جانبر ہونا مشکل تھا۔ بدقسمتی سے جب ماں اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچے کے زخم سے زہر چوس رہی تھی' اسی وقت نرس کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دیکھا کہ ماں کے ہونٹ بچے کے خون میں تر ہیں.........."

"اُف......... خدایا مجھ پر رحم کرے.........!" فرگوسن نے کہا۔ "لیکن یہ وحشیانہ حرکت یعنی میرے بچے کی گردن میں زہر آلود تیر چبھونے کی حرکت......... کس نے کی؟"

"آپ کے لاڈلے بیٹے جیک نے۔"

"جیک نے؟" فرگوسن اچھل پڑا۔ "مگر......... مسٹر شرلک ہومز........."

"آپ حیران ہوئے مسٹر فرگوسن۔" ہومز نے کہا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے۔ آپ کی بیوی جانتی تھی کہ جیک سے آپ کس قدر محبت کرتے ہیں اور اگر وہ جیک کی اس بے رحمی اور قاتلانہ حرکت کی کہانی آپ کے گوش گزار کرتی تو آپ کبھی یقین نہ

کرتے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مادام؟"

عورت نے گردن ہلا کر اقرار کیا کہ یہ سب سچ ہے۔ اب وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ "میرا خیال ہے مسٹر فرگوسن، آپ اپنے بیٹے جیک کو کم از کم ایک سال کے لیے کہیں اور بھیج دیں۔ ممکن ہے اس عرصے میں مختلف جگہوں کی سیرو سیاحت کے بعد اس کا ذہنی توازن درست ہو جائے۔ ہاں ایک امر ابھی غور طلب ہے مادام۔" ہومز نے عورت کی طرف رخ کر کے کہا۔ "گزشتہ دو روز سے آپ نے اپنے بچے کو ایسے خطرناک حالات کے باوجود اپنے سے جدا کیوں رکھا؟"

"میں نے مسز میسن کو سب کچھ بتایا دیا تھا۔" عورت نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک۔ میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" ہومز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ واٹسن، اب یہاں سے رخصت ہوں۔ براہِ کرم لندن پہنچ کر یاد دلانا۔ موریسن اینڈ ڈوڈ کے خط کا جواب بھی دینا ہے۔ وہ لوگ منتظر ہوں گے۔"

*

مافیا

منشیات کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی خفیہ تنظیم

بعض لوگوں کو آپ نے دیکھاہو گا کہ وہ منشیات یا خواب آور اور اعصابی تسکین دہ دواؤں کے عادی ہوتے ہیں......... جب تک ان کو یہ خوراک نہ ملے' وہ شدید نفسیاتی اور جسمانی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں اور نشہ استعمال کرتے ہی ان کی طبیعت ہشاش بشاش اور شگفتہ ہو جاتی ہے......... مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر صاحب ہیں' وہ جب تک خود "ہیروئن" کا انجکشن نہ لگا لیں' اپنے مریضوں کو دیکھنے کے قابل نہیں بنتے۔ ان کے دونوں بازوؤں پر میں نے ایک روز سینکڑوں ننھے ننھے سوراخ دیکھے تو ششدر رہ گیا۔

ایک پروفیسر صاحب' عرصہ دراز سے کالج میں استادی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے' لیکن کلاس میں آنے سے پیشتر وہ "مار جونا" (چرس) کے سگریٹ کے چند کش ضرور لگاتے ہیں تاکہ "تازہ دم" ہو کر "موڈ" میں آسکیں......... اسی طرح بڑے لوگوں سے لے کر چھوٹے لوگوں تک ہر پیشے اور ہر عمر کے ہزارہا افراد (مرد' عورت)

یں' جو ان منشیات کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ خواب آور گولیاں' کوکین' چرس'
نیا' افیون' پیتھی ڈائن وغیرہ سب منشیات کے زمرے میں آتی ہیں۔ میں نے اس
رست میں شراب کو دانستہ طور پر شامل نہیں کیا۔ ہرچند کہ وہ بھی نشہ پیدا کرتی ہے
کن شراب تو عام استعمال کی جاتی ہے اور اس پر ہمارے ہاں کوئی پابندی
یں......... البتہ منشیات کا ناجائز استعمال' ان کا رکھنا اور فروخت کرنا سخت جرم
سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی اہمیت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ ان میں سے بعض منشیات
قیق مادہ اور بعض سفوف کی شکل میں ہوتی ہیں۔

شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جس طرح سمگلروں کی بین الاقوامی
ظیمیں کام کر رہی ہیں' اسی طرح نشہ آور دوائیں فروخت کرنے کی بھی ایک زبردست
ن الاقوامی خفیہ تنظیم کام کر رہی ہے۔ اس کے لاکھوں افراد دنیا بھر میں چوری چھپے
کاروبار کر کے ہزارہا روپیہ کما رہے ہیں۔ جو فرد ان کے پھندے میں پھنس کر ان
وس اشیاء کے استعمال کا عادی ہو جاتا ہے' وہ ہر قیمت پر یہ منشیات حاصل کرتا ہے'
واہ اسے چوری کرنی پڑے' ڈاکہ ڈالنا پڑے' اپنی جائیداد فروخت کرنا پڑے۔ وہ اس
مد کے لیے بھیک تک مانگنے سے گریز نہیں کرے گا۔ کیونکہ۔ ؏

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آیئے اب آپ کو تہذیب نو کے امام امریکہ کے بارے میں چند دلچسپ باتیں
یں۔ وہاں منشیات کا ناجائز کاروبار انتہائی عروج پر ہے۔ خود امریکی اربابِ اختیار
ں مسئلے کا اب تک حل تلاش نہیں کر سکے ہیں اور انہیں تسلیم ہے کہ موجودہ دور
سماجی مسائل میں منشیات کے روز افزوں استعمال اور خرید و فروخت کا کاروبار
ائی تباہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق امریکہ میں اس وقت
ھ ہزار افراد نشئی ہیں اور یہ لوگ منشیات خریدنے کے لیے ہر سال ۱۸ کروڑ پونڈ
خطیر رقم صرف کرتے ہیں۔ یہ افراد نہ صرف ایسا کاروبار کرنے والوں کی بلاواسطہ یا
اسطہ سرپرستی کرتے ہیں بلکہ خود بھی بعض اوقات خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔ ہر

امریکی "نشئی" کو اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے روزانہ سات پونڈ سے چودہ پونڈ تک خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اوسط آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور جب روپیہ نہ ہو گا تو وہ مجبوراً" چوری یا ڈاکہ ڈالنے پر تیار ہو جائے گا۔

امریکہ کے ارباب اختیار کا کہنا ہے کہ ملک میں ہونے والے جرائم میں پچاس فی صد ایسے جرائم ہیں جو ان نشئی افراد کے باعث وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں 2 پونڈ 2 شلنگ ہیروئن کی قیمت پانچ سو پونڈ ہے۔ لیکن یہی ہیروئن جب امریکہ میں پہنچتی ہے تو اس کی قیمت ایک لاکھ پچیس ہزار پونڈ تک وصول کی جاتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ کاروبار کرنے والے افراد کس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹتے ہیں۔ ہر وہ فرد جس کے پاس یہ ہیروئن پہنچتی ہے' اپنے خاص طریقے سے اسے فروخت کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ جوں جوں یہ نئے ہاتھوں میں آتی رہتی ہے' توں توں اس میں ملاوٹ ہوتی رہتی ہے۔ اور مشرقِ وسطیٰ سے لے کر امریکہ میں ایک عام خوردہ نوش کے ہاتھوں پہنچنے تک اس میں 35 سے زائد مرتبہ ملاوٹ ہو چکی ہوتی ہے۔

اس طرح آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ یہ کام کس قدر وسیع پیمانے پر اور ایک بین الاقوامی تنظیم کی شکل میں کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی ہمہ گیریت بتاتی ہے کہ اسے کرنے والے کوئی معمولی مجرم نہیں ہیں' بلکہ ذرائع اور وسائل کی اعلیٰ ترین سہولتوں اور منظم کوششوں کے مالک ہیں۔ گویا بیوپاریوں' سرکاری ملازمتوں' ہوائی جہاز کے پائلٹوں' بحری جہازوں کے ملاحوں' کسٹم کے آفیسروں' اسمگلروں' تھوک اور خوردہ فروشوں کا ایک گروہ ہے جو یہ کام کر رہا ہے۔ امریکہ کی عام پولیس ان پر ہاتھ ڈالنے سے بے بس اور مجبور ہے' اس کے لیے ایک خصوصی ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اور اس کے خفیہ اراکین ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ مجرموں کی اس خفیہ تنظیم کے بڑے بڑے سرپرستوں کا سراغ لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں۔

امریکہ کے مقابلے میں برطانیہ کو دیکھئے تو باد یُ النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہاں منشیات کی ناجائز خرید و فروخت اور استعمال کا مسئلہ زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ جہاں تک سرکاری حکام کی رپورٹ کا تعلق ہے اس کے مطابق تو یہ مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور انہیں یقین ہے کہ کوئی خفیہ بین الاقوامی تنظیم یہ کام سرانجام نہیں دے رہی ہے۔ برطانیہ کے سرکاری اعداد و شمار ہیں کہ 1958ء میں کل 442 افراد منشیات استعمال کرنے کے عادی تھے' جن میں 245 عورتیں تھی لیکن حقیقت میں یہ رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے۔ نیشنل ہیلتھ سروس نے اب تک ملک میں جتنے بھی "شیئ" پائے جاتے ہیں' ان کو رجسٹرڈ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ لندن کا بدنام ترین علاقہ ویسٹ اینڈ منشیات کی خرید و فروخت کا بہت بڑا اڈہ بنا ہوا ہے اور ہر وہ شخص جو ذرا سی بھی کوشش کرے اپنا مطلوبہ نشہ آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ منشیات خریدنے کی معروف جگہیں وہ چھوٹے شراب خانہ ہیں جن کے مالکوں کو "مِک" کہا جاتا ہے۔ یہ پر اسرار "مِک" ہی آپ کی ضرورت پوری کر سکیں گے لیکن آپ ان سے براہِ راست اپنا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ساری باتیں مخصوص اشاروں اور کنایوں میں ہوتی ہیں۔ "مک" آپ کو کچھ دینے سے پیشتر یہ یقین کر لینا ضروری سمجھے گا کہ آپ کا تعلق پولیس سے تو نہیں۔

اسے یقین دلانے کے لیے آپ کے پاس ٹھوس دلائل ہونے چاہئیں۔ جب وہ آپ کی "شخصیت" سے مطمئن ہو جائے گا تو کہے گا۔

"بھائی صاحب! آپ کو معلوم ہے ان دنوں چائے بڑی مہنگی ہو رہی ہے۔ غضب خدا کا ایک پیکٹ کے لیے نصف پونڈ خرچ کرنا پڑتا ہے۔"

اس فقرے کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے' کہ چرس کے ایک سگریٹ کی قیمت دو شلنگ چھ پنس ہو گی۔ اسی طرح دوسری منشیات کی قیمتیں خفیہ الفاظ میں بتائی جاتی ہیں۔ برطانیہ میں کثرت سے استعمال ہونے والی منشیات میں چرس کا درجہ سب سے اول ہے۔ اس کا سائنٹیفک نام۔ "کینیبس سیٹیوا" ہے۔ چرس استعمال کرنے والے

اس کے یوں عاشق ہیں کہ وہ انہیں پر سکون دنیا سے آشنا کرتی ہے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی رفتار ست ہو گئی ہے اور وہ ان کے قدموں تلے ہے۔ چنانچہ برطانیہ کے موسیقاروں میں چرس کے سگریٹ بڑے مقبول ہیں اور اس نشے میں زیر اثران کے آلات موسیقی سے نئی نئی دھنیں اور نئے نئے نغمے پھوٹتے رہتے ہیں۔

دوسرے درجے پر ہیروئن ہے۔ اس کے استعمال کرنے والے زیادہ تر ایسے افراد ہیں جو غم جاناں اور غم دوراں' دونوں سے فرار حاصل کر کے ایک حسین' خیالی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے نشے میں وہ سارے تفکرات بھول جاتے ہیں۔ یہی اثر مارفیا اور پیتھی ڈائن کے انجکشن اور گولیاں دکھاتی ہیں۔ یہ تینوں منشیات دراصل افیون کا ست ہیں۔

اس کے بعد کوکین کا درجہ ہے۔ اس کے استعمال کرنے والے قلیل تعداد میں ہیں۔ اسے کھا کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں نئی قوت آ گئی ہے اور دنیا کا کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ ایسا نہیں جو وہ حل نہ کر سکتے ہوں۔ اس کا نشئی ہر بلند سے بلند کام کو آنا" فانا" کرنے کے تصور میں محو رہتا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان منشیات کا عادی محض چلتی پھرتی ایک لاش کی مانند رہ جاتا ہے۔ کوئی بہت ہی پختہ قوت ارادی کا مالک ہو تو ان کے پنجے سے رہائی حاصل کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ نشہ مرتے دم تک نہیں چھوٹ پاتا۔ جب تک اسے مطلوبہ نشہ نہ ملے' اس کی حالت جان کنی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ سارے جسم میں ایک ناقابلِ برداشت اینٹھن اور اعصاب میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دم لبوں پر آ جاتا ہے۔ اگر نشہ میسر آ جائے تو فبہا ورنہ جان تک جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ نشہ بہم پہنچانے کے لیے "مافیا" کی خدمات حاضر ہیں۔

منشیات کی ناجائز تجارت کی اس بین الاقوامی خفیہ تنظیم کا نام "مافیا" ہے۔ جس کا جال مشرقِ وسطیٰ سے لے کر امریکہ تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی شاخیں ہر چھوٹے بڑے شہر میں کام کر رہی ہیں' لیکن دنیا میں صرف چند ہی ایسے لوگ ہیں جو

اس بین الاقوامی تنظیم کی اصل تقسیم کار سے واقف ہیں۔ ان میں امریکہ کے محکمہ انسداد منشیات کے بعض آفیسران ، فرانسیسی اور بین الاقوامی پولیس "انٹرپول" کے مخصوص سراغرساں شامل ہیں۔ ان محکموں نے مل جل کر اس تنظیم کی سرگرمیوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے کام کا آغاز لبنان سے ہوا جہاں مجرموں کا ایک گروہ سمیع الخوری نامی ایک شخص کی رہنمائی میں منشیات کا کاروبار کر رہا تھا۔ سمیع الخوری دراصل منشیات کا تھوک فروش تاجر تھا۔ اس نے اٹلی اور کارسیکا میں کام کرنے والے دو گروہوں کے افراد سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور لبنان سے چرس سمگل ہو کر پہلے اٹلی اور پھر مارسیلز اور پیرس میں پہنچ جاتی تھی۔

اٹلی کی پارٹی کا نام "مافیا" تھا۔ جس کا سردار ایک امریکی بدمعاش لکی لوسینو بیان کیا جاتا تھا اور جسے امریکہ سے چند دوسرے نامی بدمعاشوں کے ہمراہ جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ منشیات کی خرید و فروخت کئی درمیانی کڑیاں ہیں اور رقم کی وصولیابی بہت سے ہاتھوں سے گزر کر ایک خاص ہاتھ میں پہنچ جاتی؟ اس کاروبار میں جو لوگ شریک ہیں ان کی اپنی ایک مخصوص زبان بھی ہے......... جس کی مدد سے وہ سرعام کاروباری گفتگو کرتے ہیں اور کوئی شخص ان پر شبہ نہیں کر سکتا۔ ان افراد میں سابق جرمن خفیہ پولیس کے بہت سے لوگ اور سینکڑوں سمندری تاجر بھی شامل ہیں۔ رقم کا لین دین دنیا کے بڑے بڑے بینکروں اور فنانسروں کے ذریعے طے پاتا ہے۔ یہ معاملات اکثر سوئٹزرلینڈ میں مکمل طور پر طے ہوتے ہیں۔

اب ہم آپ کو "مافیا" سے مزید متعارف کراتے ہیں۔ دنیا بھر میں اور خصوصاً امریکہ میں منشیات کی سمگلنگ اور خرید و فروخت کا وسیع کاروبار کرنے والی تنظیم کا نام "مافیا" ہے۔ بلکہ امریکہ کے محکمہ عدل کے الفاظ میں اسے جرائم کی مؤثر ترین خفیہ "حکومت" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس جماعت کے ارکان سب کے سب لکھ پتی اور کروڑ پتی ہیں، جو صرف منشیات کی ناجائز تجارت ہی نہیں کرتے بلکہ بردہ فروشی، جوا اور دوسری اشیاء کی سمگلنگ کا کاروبار بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس جماعت کا

رکن خاص بننے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور کئی دشوار گزار مرحلوں سے گزر کر ہی یہ اعزاز نصیب ہو سکتا ہے۔ نئے فرد کو جماعت میں شامل کرتے وقت اچھی طرح اس بات کی تسلی کرلی جاتی ہے کہ اس کا تعلق پولیس سے تو نہیں......... اور اگر کسی وقت وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو زبان تو نہیں کھولے گا' خواہ اسے مر جانا ہی کیوں نہ پڑے۔

"مافیا" آج سے چالیس سال پیشتر سب سے پہلے سسلی میں قائم کی گئی تھی اور اس طویل عرصے میں اس کا کاروبار دنیا بھر میں پھیل گیا تھا۔ اس کے ارکان میں پیشتر ایسے ہیں جو مالی اور سماجی حیثیت سے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ پولیس کو معلوم ہے کہ کون کون لوگ اس مشینری میں کس پرزے کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں لیکن اسے ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ سارا سلسلہ اس خوبصورتی سے منظم کیا گیا ہے کہ پولیس کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تنظیم سے غداری کرنے والے کی سزا موت ہے۔ ذرا سا شک گزرتے ہی کہ فلاں رکن پولیس سے تعلق یا رابطہ قائم رکھتا ہے' بے دھڑک اسے موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ نیو یارک میں دن دہاڑے جو قتل کی وارداتیں ہوتی ہیں' ان میں سے اکثر کے پیچھے "مافیا" کا ہاتھ بتایا جاتا ہے اور پولیس کو آج تک پتہ نہیں ہو سکا کہ ان افراد کو کیوں قتل کیا گیا؟ اس کا راز سوائے مافیا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

امریکہ کے بد نام ترین بد معاش البرٹ انس ٹاسا کی مثال لے لیجئے۔ جسے 1957ء میں دن دہاڑے گولی مار دی گئی تھی۔ اس وقت مقتول پارک شرٹن ہوٹل کی ایک باربر شاپ میں حجامت بنوا رہا تھا۔ گولی شیشہ توڑتی ہوئی البرٹ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ اس طرح گزشتہ سال ماہ جنوری میں قتل کی ایک لرزہ خیز واردات پیش آئی تھی اور عین نیو یارک فیڈرل کورٹ کے احاطے میں......... اور پھر مافیا کے بیس ارکان کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ جس کے نام اطالوی زبان میں تھے اور ان کو صرف تین سے پانچ سال تک قید کی سزا دی گئی۔ ان دنوں نیو یارک میں مافیا کے

63 ارکان کام کر رہے تھے۔ ان میں کیلیے فورنیا' فلوریڈا اور ٹیکساس کی ریاستوں کے افراد ، کیوبا اور اٹلی تک کے لوگ شریک تھے۔

یہ بیس افراد جنہیں قید کی سزا دی گئی' پولیس کے شدید ترین تشدد کا شکار رہے لیکن آفرین ہے ان کی ہمت' ثابت قدمی اور استقلال پر کہ مافیا سے متعلق کوئی راز ان کی زبان پر نہ آیا۔ کیونکہ یہ سب کے سب بخوبی جانتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ لیکن مافیا کے قانون میں موت سے کم کوئی سزا نہیں۔ تعجب اس امر پر ہے کہ ان افراد کے خلاف عدالت میں یہ جرم ثابت نہیں ہو سکا کہ وہ منشیات کی ناجائز تجارت کرتے تھے' بلکہ ان کو مختلف الزامات میں ملوث کر کے سزا دی گئی۔ یہ مافیا کے طریق کار کا کمال ہے کہ اس کے کسی رکن کو بھی کبھی نشہ آور دوا کے ہمراہ گرفتار نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ ایسی چیزیں اپنے ہاتھوں میں آنے ہی نہیں دیتے' بلکہ بالا بالا ہی انہیں گاہکوں تک پہنچا دیتے ہیں اور پولیس اکثر ان لوگوں کو پکڑ لیتی ہے جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ بے خبری میں کس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مافیا اعلیٰ سائنٹیفک طریقے استعمال کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امریکہ کے محکمہ انسداد منشیات کی پولیس مختلف ممالک کے پولیس محکموں کے ساتھ تعاون کر کے "مافیا" کو جڑ سے اکھیڑنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس کے خفیہ ایجنٹ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ مجرموں کا سراغ لگائیں۔ اور کئی بار انہوں نے زیادہ مقدار میں منشیات سے بھرے ہوئے صندوقوں پر قبضہ بھی کیا ہے۔ بہت سے مجرم گرفتار بھی کیے ہیں لیکن کاروبار جس برق رفتاری سے چل رہا ہے اسی پر قائم ہے۔ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ ایک سمگلر گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے۔ اس تجارت کو روکنے کی واحد صورت یہی ہے کہ منشیات کے اصل منبع کو تباہ کر دیا جائے۔

یہ صورت بادیٔ النظر میں جتنی آسان معلوم ہوتی ہے اتنی نہیں ہے۔ بین

الاقوامی پولیس کے حکام اعلیٰ بخوبی جانتے ہیں کہ ترکی میں ایک خاص مقام پر پہاڑوں کی وادیوں کے درمیان پوست کی کاشت ہوتی ہے اب دوسرے اور ممالک ہیں جہاں پوست کاشت کی جاتی ہے اور وہیں سے افیون تیار ہو کر تقسیم کنندگان کے پاس پہنچتی ہے جو اسے دنیا بھر میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگرچہ اقوام متحدہ نے افیون کی اس ناجائز پیداوار کو اپنی ایک قرار داد کے ذریعے بند کرنے کا حکم دیا تھا اور اس مقصد کے لیے گزشتہ سال مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں ایک تحقیقاتی مشن بھی روانہ کیا گیا' جس نے صورت حال کی واضح نشان دہی کی لیکن پوست کی کاشت اب تک جاری ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ طبی دنیا میں افیون کی مانگ بے حد ہے اور جس کو برآمد کرنے والا واحد ملک دنیا میں ترکی ہے لیکن افیون سے تیار شدہ دو دوائیں "مارفین اور ہیروئن" طبی حیثیت سے اتنی استعمال نہیں ہوتی جتنی عادی نشئی انہیں استعمال کر رہے ہیں اور جن کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہو چکی ہے۔ بیچارہ ترکی اس معاملے میں مجبورا اور بے بس ہے۔ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ انہی دواؤں کی فروخت پر منحصر ہے۔

فرض کیجئے کہ آج وہ افیون' مافین ہیروئن اور سوڈین کی پیداوار قطعی طور پر بند کر دیتا ہے تو ان کروڑوں بندگان خدا کا کیا حشر ہو گا جو اپنی بد نصیبی کی بدولت ان منشیات کے عادی ہو چکے ہیں اور جن کو وقت معین پر نشہ دستیاب نہ ہوا تو جان' جانِ آفرین کو سونپ دینے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ چنانچہ ترکی حکام کی رائے میں منشیات کی پیداوار پر قدغن لگانا اور ملک سے اس کی ناجائز برآمد روکنے کا کام فی الحال ناممکنات میں سے ہے۔ دوسری طرف وہ ترک کسان جو پوست کی کاشت کر رہے ہیں' ان کی زندگی کا بڑا سہارا یہی افیون ہے۔ منشیات کے سمگلران سے گراں معاوضے پر افیون خریدتے ہیں اور پھر یہ ذخیرہ استنبول پہنچا دیا جاتا ہے' جہاں تنظیم کے خفیہ ہیڈ کوارٹر کھلے ہوئے ہیں۔ باہر کے خریداروں کو اطلاع دے دی جاتی ہے کہ "مال" تیار ہے۔ مختلف "خریدار" پیشگی رقوم جمع کرا دیتے ہیں اور پھر منشیات کا یہ

ذخیرہ مختلف ذرائع سے ترکی اور شام کی شمالی سرحد تک اور پھر الیو پہنچ جاتا ہے۔ الیو سے یہ مال اونٹوں یا موٹروں کے ذریعے شام اور بیروت سمگل کر دیا جاتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پولیس کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ امریکی محکمہ انسداد منشیات کے کمشنر مسٹر ہینری کا ارادہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں منشیات کے فروغ کے اس سب سے بڑے اڈے کو کسی طرح تباہ کر دیا جائے' جہاں ترکیہ شام اور لبنان کے سمگلر آپس میں تجارتی رابطہ قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ پولیس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور واشنگٹن کی ہدایات پر قابل ترین سراغرسانوں کو اس علاقے میں بھیج دیا گیا ہے۔ پہلی کامیابی جولائی 1955ء میں ظاہر ہوئی جبکہ دو افراد کو ایک سو کلوگرام افیون کے ہمراہ ازبر کے مقام پر گرفتار کیا گیا۔ تفتیش کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ اوسک کے علاقے میں ایسے کاشت کار ہیں جو ناجائز طور پر افیون کی کاشت کرتے ہیں اور انہوں نے یہ مال انہیں سے خریدا ہے۔ مجرموں نے یہ بھی بتایا کہ ازبر میں "مافیا" کے تحت کام کرنے والی شاخ کا سردار کون ہے۔ یہ ایک پچیس سالہ نوجوان تھا' اور کاشت کاروں سے افیون خرید کر سمگلروں کو مہیا کرتا تھا۔ اس کی مالی حیثیت بہت بلند تھی۔ اس کا نام محمدوئی تھا۔ یہ نیا سراغ ملتے ہی ترکی پولیس افسران نے اس نوجوان سے رابطہ قائم کیا۔ پولیس کے ہمراہ لبنان سے آیا ہوا امریکی سراغرساں جیمز بھی تھا۔ پولیس نے جیمز کو ہدایت کی کہ وہ محمدوئی سے ایک ایسے شخص کی حیثیت میں اپنا تعارف کرائے جسے منشیات کی سپلائی کے لیے نئے ذرائع کی ضرورت ہے۔ اور وہ اپنے وقت میں نیویارک کے بدمعاشوں کا سرتاج سمجھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں محمدوئی نے جیمز کی شخصیت کو مشکوک سمجھ کر اس سے کوئی بات نہ کی۔ لیکن جیمز نے اپنا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کر کے اسے یقین دلا دیا کہ وہ واقعی "مافیا" ہی کا ایک رکن ہے۔ انہوں نے کئی راتیں نائٹ کلبوں میں اکٹھے گزاریں اور گہرے دوست بن گئے۔ آخر ایک روز محمدوئی نے اپنے دوست کو ایک اور شخص محمد اوزیرک سے ملوایا جو افیون کے سب سے بڑے ذخیرے کا مالک تھا۔

اس نے جیمز سے کہا کہ وہ ضرورت کے مطابق زیادہ سے زیادہ مارفین مہیا کر سکتا ہے اور فی کلو گرام سات ہزار پونڈ قیمت وصول کی جائے گی۔ قیمت پر ان کے درمیان گھنٹوں بحث و تکرار ہوتی رہی اور آخر چار ہزار پونڈ فی کلو گرام پر معاملہ طے ہو گیا اور یہ بھی طے پایا کہ تیسرے روز رات کو مطلوبہ مقدار میں مارفین مہیا کر دی جائے گی۔

تین یوم کی مہلت جیمز کے لیے کافی تھی۔ وہ فوراً" ہوائی جہاز کے ذریعے استنبول پہنچ گیا اور ترکی پولیس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ قصہ مختصر پولیس نے ان سب تھوک فروشوں کو منشیات کے ذخیروں سمیت گرفتار کر لیا۔ گرفتاری سے پیشتر پولیس اور بدمعاشوں کے درمیان دیر تک فائرنگ بھی ہوئی۔ بالآخر پولیس نے ان پر قابو پا کر مکان کی تلاشی لی تو تہہ خانوں میں کئی من خام افیون کے ذخائر دستیاب ہوئے جس کی امریکہ میں یقیناً" کروڑوں ڈالر قیمت وصول کی جاتی۔ انہیں تہہ خانوں میں ایسی متعدد لیبارٹریاں بھی پائی گئی جہاں افیون کو مارفین اور ہیروئن میں تبدیل کیا جاتا تھا۔

اس واقع کے بعد کئی ماہ تک لبنان اور شام میں منشیات کی ترسیل کا سلسلہ معطل رہا لیکن اس تمام عرصے میں مال نہ پہنچنے پر دوسرے بیوپاریوں کو شدید تشویش لاحق رہی اور پولیس کی سخت رکاوٹ کے بعد اسے پھر شروع کیا گیا اور پہلے سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اور نئے نئے انتظامات کے تحت......... اٹلی، فرانس اور جرمنی میں گاہک پیدا کیے گئے اور تمام معمل خانوں اور خفیہ گوداموں کو استنبول سے ان ممالک میں منتقل کر دیا گیا۔

بین الاقوامی پولیس اس تنظیم کو کلیتہ" ختم کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہی ہے۔ یہ مسئلہ اب اقوام متحدہ میں پیش ہے لیکن وہ بھی سوائے قرارداد منظور کر دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔

*

حادثے کے بعد

دنیا میں کوئی شوہر اپنی بیوی سے اتنا نالاں و عاجز نہ ہو گا جتنا فریڈ ٹیز تھا۔ اس کی بیوی کلارامی عورت کیا' ایک آفت تھی' بلائے جان تھی اور خدا کا جیتا جاگتا عذاب......... بے چارہ فریڈ دن بھر دفتر میں کولہو کے بیل کی مانند کام کرتا' افسروں کی جھڑکیاں سنتا اور شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا' تو کلارامی اس کے سر پر چڑیل بن کر سوار ہو جاتی۔ کوئی ایک بات ہو تو ذکر کیا بھی جائے۔ یہ عورت تو چلتی ہوا سے لڑتی تھی۔ فریڈ کو دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیتی اور ایسی بے نقط سناتی کہ پڑوس والے بھی کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔

ان کا مکان سڑک کے بالکل ساتھ تھا اور وہ نچلی منزل میں رہتے تھے۔ فریڈ اپنی پرانی کھڑکھڑاتی کار سیدھا گیراج میں لے جا کر روکتا۔ ایک دن بھی ایسا نہ تھا جب کلارامی اس کے انتظار میں گیراج کے باہر یا فٹ پاتھ پر کھڑی نہ ملتی۔ جونہی وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا' کلارامی' شکوے شکایت کا پلندہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ مثلاً" تم نے گیس کا بل آج بھی جمع نہیں کرایا ہو گا......... غضب خدا کا' کتنے سست اور ناکارہ آدمی سے پالا پڑا ہے......... چیخ چیخ کر تھک گئی' مگر تمہارے کانوں پر جوں نہیں

ریگتی......... خدا غارت کرے تمہیں......... مسٹر فولے سے ملے تھے تم؟ نہیں ملے؟ آج بھی ان کے بچے گیراج میں گھسے ہوئے کھیل رہے تھے۔ کم بختوں کو یہیں مرنا ہوتا ہے......... آخری بار ان کو سمجھا دو کہ اگر وہ بے ہودہ بچے یہاں آئے تو ان کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔ میں نے پہلے بھی انہیں بتایا تھا' لیکن تمہاری طرح مسٹر فولے بھی کسی ڈھیٹ نسل کے آدمی ہیں.........

فریڈ کے ضبط کا پیمانہ آہستہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے بہت نرم لہجے میں بیوی کو اس بد زبانی سے باز رہنے کی تلقین کی' لیکن بھینس کے آگے بین بجانے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کی بے عزتی کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ پڑوس میں رہنے والی وہ منحوس صورت بڑھیا جس کا نام مسز ہیکٹ تھا' دن رات جب دیکھو اپنے آنگن میں آرام کرسی بچھائے بیٹھی ان میاں بیوی کی تکرار سے لطف اندوز ہوا کرتی۔ پھر روز کے روز دوسرے مکانوں تک یہ واقعات نمک مرچ لگا کر پہنچا دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ فریڈ ٹیز کی صورت دیکھتے ہی مسکراتے' ہنستے اور ترس کھا کر آپس میں کہتے۔ "بے چارہ کس مصیبت میں پھنس گیا! سچ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی........."

فریڈ یہ باتیں سنتا اور تلملا کر رہ جاتا۔ واقعی لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ یہ ساری مصیبت خود اسی کی مول لی ہوئی ہے۔

بات یہ تھی کہ فریڈ ایک قلاش' بے سہارا اور غریب آدمی تھا اور اس نے اپنی حیثیت دیکھے بغیر کلارامی جیسی امیر عورت سے اس لالچ میں شادی رچالی تھی کہ زندگی کے یہ کٹھن اور پھیکے شب و روز رنگین ہو جائیں گے' لیکن کلارامی بہت چالاک اور مکار نکلی۔ اس نے ایک پیسہ اپنی یا اپنے شوہر کی ذات پر صرف کرنا گناہ سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس تقریباً" دو لاکھ ڈالر کی نقد رقم بنک میں موجود تھی' پھر جس مکان میں وہ رہتے تھے' یہ بھی کلارامی ہی کی ملکیت تھا۔ اس کے علاوہ زر و جواہر اور انشورنس پالیسی بھی تھی۔ یہ عورت کچھ فطری طور پر ہی از حد بخیل واقع ہوئی تھی۔ چلو مان لیا کہ وہ اپنے شوہر پر کچھ خرچ کرنا نہیں چاہتی لیکن کم از کم اپنی حالت تو

درست کرے۔ پھٹے پرانے کپڑے ہی پہنے پھرتی رہتی۔ جرابیں تک پھٹ چکی تھیں اور جوتا بھی گھس چکا تھا' مگر کیا مجال کہ نئی خرید لائے۔ ایسی بیوی بھلا شوہر کی کیا پروا کرتی۔ یوں بھی وہ عمر میں فریڈ سے ایک دو نہیں' پورے آٹھ سال بڑی تھی۔ موٹی' پھولی ہوئی' بھدی اور خونخوار۔

جب وہ گیراج میں کار کھڑی کر کے بیرونی کمرے میں آیا اور دھڑام سے صوفے پر گر پڑا' تب بھی کلارامی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ممکن ہے فریڈ بیمار ہو یا بہت زیادہ تھکن کا شکار ہو' برابر بکواس کیے گئی۔ اس کی آواز فریڈ کے سر پر آہنی ہتھوڑے کی مانند بج رہی تھی۔

"اس سال یہ بھڑیں بھی کچھ زیادہ ہو گئی ہیں........." اس نے چلا کر کہا۔ "اگر تم نے بہت جلد ان کا کچھ انتظام نہ کیا' تو دیکھ لینا یہ ہمیں ڈنک مار مار کر مار ڈالیں گی۔ فوراً" کوئی دوا لاؤ اور مکان میں چھڑکو تاکہ یہ موذی بھڑیں دوبارہ نہ آئیں......... مجھے ان سے بیحد ڈر لگتا ہے۔"

بہت خفیف سی مسکراہٹ' برسوں بعد فریڈ کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا چلو کوئی تو چیز دنیا میں ایسی ہے جس سے یہ بے ہودہ عورت خوف کھا سکتی ہے۔ خواہ ایک ننھی سی بھڑ ہی سہی......... اس کی عمر کے چھیالیس برس بیت گئے تھے اور نہیں یاد آیا کہ ایک بار بھی بھڑ نے اسے ڈنک مارا ہو اور اب یہ ظالم عورت اسے بھڑوں سے ڈرا رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ فریڈ کو کبھی بھڑ کے ڈنک کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ وہ گردن جھکائے کلارامی کی بکواس سن رہا تھا اور اس روز تو کلارامی نے جیسے چپ نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"آخر تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا بہرے پتھر ہو گئے؟" وہ دانت پیس کر بولی۔ "میں اتنی دیر سے چیخ رہی ہوں اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔ یہ بھڑیں بہت خطرناک ہوتی ہیں......... ان کے ڈنک میں زہر ہے......... اور میں نے سنا ہے اس زہر سے آدمی مر بھی جاتے ہیں........."

وہ ایک دم چونک کر بیوی کی صورت تکنے لگا۔ بھلا اس لحیم شحیم عورت کا ایک بھڑ کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اسے تو کوئی کوبرا سانپ ہی ڈسے تو یہ مرے۔ غالباً" فریڈ کے یہ خیالات کلارامی کے ذہن تک پہنچ گئے۔ اس نے گرج کر کہا۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ بھڑیں کاٹنے سے یہ مرجائے' تو پاپ کٹے......... لیکن کان کھول کر سن لو فریڈ!......... میں اس آسانی سے مرنے والی نہیں......... اور اگر مر بھی گئی تو یاد رکھنا میری جائیداد میں سے ایک دھیلا بھی تمہیں نہ ملے گا......... بے شک ابھی میں نے اپنی وصیت تیار نہیں کی ہے لیکن میں سارا روپیہ' یہ مکان اور انشورنس سے ملنے والی رقم اپنے پیارے بھانجے کو دے جاؤں گی۔"

وہ ایک دم ہنس پڑا اور نرمی سے بولا۔

"تم تو ایک دم ناراض ہو جاتی ہو......... بھلا میں تمہارے بارے میں خدا نخواستہ ایسی بات سوچ سکتا ہوں؟ میں کل ہی ان کم بخت بھڑوں کا علاج کرتا ہوں پھر تم دیکھنا اگر ایک بھڑ بھی دکھائی دے جائے تو جو چور کی سزا' وہ میری......... چلو' اب غصہ تھوک دو اور کھانا لے آؤ' سخت بھوک لگی ہے......... یوں بھی صبح سے میرے گھٹنے میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ ایک پل کو قرار نہیں ملا۔"

کلارامی نے گہری نظروں سے فریڈ کا جائزہ لیا۔ کچھ ترس آیا......... اور بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ فریڈ نے گہرا سانس لیا اور بھڑوں کے فلسفے پر غور کرنے لگا' پھر اسے بیوی کا وہ بھانجا یاد آیا جس کے نام وہ اپنی ساری دولت منتقل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ وہ بے وقوف گدھا......... کسی کالج میں علم حیوانات کا پروفیسر تھا اور یہی بھڑ جیسے کیڑے مکوڑے اور نہ جانے کون کون سے حشرات الارض اس کا خاص موضوع تھے......... اونہہ......... دیکھی جائے گی......... فریڈ نے سوچا......... مگر سوال یہ تھا کلارامی سے نجات کیونکر حاصل کی جائے؟ کیا طلاق دے دوں؟ لیکن اس سے فائدہ؟ جس مکان میں رہتا ہوں یہ تو اسی عورت کا ہے؟ وہ مجھے فوراً" ان دو کپڑوں میں نکال باہر کرے گی......... پھر میرے ہاتھ کیا آئے گا؟ کیا اس

کی طبعی موت کا انتظار کروں؟ جی نہیں......... یہ عورت شاید ہی اپنی طبعی موت مرے......... اس کی عمر اس وقت چون برس ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ مزید چون برس اسی طرح اور گزار سکتی ہے......... فریڈ نے آپ ہی آپ مایوس ہو کر نفی میں گردن ہلائی......... اس طرح کام نہیں چلے گا مسٹر فریڈ ٹیز......... تمھیں کچھ اور سوچنا پڑے گا.........

اتنے میں ڈرائنگ روم سے کلارامی کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب آ کے کھانا ٹھونس لو......... لونڈی نے میز سجا دی ہے۔"

وہ ہمیشہ سے تنہا کھاتا تھا۔ اس کی بیوی اپنے لیے الگ کھانا پکاتی......... اسے دراصل پکانا بھی نہیں آتا تھا......... ایک امیر باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اس نے کبھی خانہ داری جیسے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جو روکھا پھیکا پکا کر سامنے رکھ دیا' وہ فریڈ نے چُوں چرا کیے بغیر کھا لیا اور خدا کا شکر بجا لایا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کھانے کی بدمزگی پر اشارۃً کچھ کہا تو سینکڑوں صلواتیں جواب میں سننے کو ملیں۔ مہینے میں جو تنخواہ اسے ملتی' کلارامی ایک ایک پائی کا حساب لے لیتی۔ بارہا فریڈ کا یہ بے مزہ کھانا کھا کر جی اکتایا اور سوچا کسی اچھے سے ریستوران میں جا کر اپنی پسند کا کھانا پیٹ بھر کر کھائے' لیکن بیوی کے خوف سے جرأت ہی نہ ہوئی' ارادے پر عمل کرنے کی......... بے چارہ ہمیشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے پائپ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لیتا رہا کہ یکایک اسے کھانسی آئی اور وہ بلغم تھوک کر جب واپس کرسی پر بیٹھا' تو بیوی نے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم یہ بدبودار......... گھٹیا اور انتہائی زہریلا تمباکو میرے سامنے مت پیا کرو......... مجھے سخت گھن آتی ہے اس سے......... پھر دمے کے مریضوں کا کھانسا اور بھی قابلِ نفرت ہے........."

وہ تلملا کر رہ گیا۔ جی میں آیا گلدان اٹھا کر اس کی کھوپڑی پر دے مارے، مگر اتنا ہی کہہ سکا۔ "میں خود اس تمباکو سے نالاں ہوں، لیکن کیا کروں۔ بڑھیا تمباکو خریدنے کی جیب اجازت نہیں دیتی......... اگر تم چاہو، تو میری یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" عورت نے آنکھیں نکالیں۔ "گویا میں اپنے پیسے تمہیں آگ میں پھونکنے کے لیے دے دوں؟ کیا حرام کی کمائی ہے میرے پاس؟ اور شرم نہیں آتی تمہیں مجھ سے مانگتے ہوئے؟ بجائے اس کے کہ خود مجھے کوئی تحفہ لا کر دیا کرو، الٹا میرے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے۔ بے غیرتی کی حد کر دی تم نے فریڈ۔"

فریڈ دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے دل میں کہا ایسا سلوک تو کسی گھر میں پالتو کتے سے بھی نہیں کیا جاتا ہو گا......... تمہاری سزا یہی ہے......... اور کرو امیر عورت سے شادی......... پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے......... اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور اٹھ کر اپنے بستر پر جا لیٹا......... اسے بے طرح رونا آ رہا تھا......... زندگی برباد کر دی تم نے فریڈ ٹیز......... اب اس عورت کے پھندے سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں......... کوئی راستہ نہیں......... پھر اس کے سامنے ایڈلے گمبال کی صورت آن کھڑی ہوئی......... وہ ایک بیوہ عورت تھی جو اس کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتی......... وہ ایڈلے کا موازنہ اپنی بے رحم بیوی سے کرنے لگا......... زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں......... ایڈلے کتنی حسین، کتنی خوش اخلاق اور کتنی ہمدرد عورت ہے......... کاش! وہ اس سے شادی کر سکتا!......... ابھی تک کسی اور نے اس سے شادی کی پیشکش غالباً نہیں کی......... ویسے بھی وہ مجھے پسند کرتی ہے......... لیکن اسے یہ بھی تو علم ہے کہ میں ایک معمولی کلرک ہوں جس کی تنخواہ معمولی ہے اور جس کے پاس سر چھپانے کے لیے اپنا ذاتی مکان بھی نہیں......... ان حالات میں وہ مجھ سے شادی کیوں کرے گی؟ ہاں......... اگر میرے پاس دولت ہو......... اپنا مکان ہو......... پھر وہ خوشی سے راضی ہو جائے گی......... لیکن دولت

اور مکان آئے کہاں سے؟ اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ کلارامی کی چھٹی کرا دی جائے اور یہ چھٹی اتنی جلد ہو کہ اسے اپنے اس بے ہودہ ماہر حشرات الارض پروفیسر بھانجے کے نام وصیت تیار کرنے کا موقع نہ مل سکے.........

وہ رات گئے تک سوچتا رہا........ سوچتا رہا........ بیوی سے چھٹکارا پانے کی بہت سی تدبیریں اس کے ذہن میں آئیں' مگر سب میں کوئی نہ کوئی خامی اور کہیں نہ کہیں خلا تھا........ فرض کرو میں اسے قتل کر دیتا ہوں' تب کیا ہو گا؟........ مجھے پھانسی ہو جائے گی یا عمر قید........ میرا مدعا تو بہرحال پورا نہ ہوا........ قتل اس طرح کیا جائے کہ وہ ایک حادثہ دکھائی دے........ المناک حادثہ........ جس میں مجھ پر کوئی الزام نہ آئے.........

دفعتہ" ایک تدبیر چپکے سے اس کے ذہن میں آ گئی........ اسے خیال آیا اگر وہ "غلطی" سے اپنی بیوی کو کار کے نیچے کچل دے' تو؟........ ہر شام وہ گیراج کے باہر یا فٹ پاتھ پر کھڑی ملتی ہے۔ ایک دم کار کی سپیڈ پچاس ساٹھ میل فی گھنٹہ کر دے گا........ بس ایک جھٹکا ہی اسے موت کے منہ میں پہنچا دینے کے لیے بہت ہے........ بعد میں کہا جا سکتا ہے' کار کے بریک فیل ہو گئے تھے........ یا غلطی سے پاؤں بریک کے بجائے ایکسیلیٹر پر جا پڑا تھا........ کار کی بریکیں بھی میں خود خراب کر دوں گا........ مسز ہیکٹ اس حادثے کی چشم دید گواہ ہو گی........ وہ عدالت میں بیان دے سکتی ہے کہ کار بے قابو ہو گئی تھی اور کلارامی کچلی گئی........ اس قسم کے حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں .... لیکن یہ پولیس کے سراغرساں بہت تیز ہوتے ہیں مسٹر فریڈٹیز .... بال کی کھال نکال لیتے ہیں .... اگر انہیں شبہ ہو گیا کہ میں نے خود کار کے انجن میں یا اس کی بریکوں میں گڑ بڑ کی ہے' تو پھر کیا ہو گا؟ گئے سیدھے بڑے گھر........ اس کے بعد قیامت تک تمہاری شادی ایڈلے گمبال سے نہ ہو سکے گی .... نہیں جناب .... یہ تدبیر نہیں چلے گی .... کچھ اور سوچو........ کوئی ایسا حادثہ جس میں شک اور شبے کی قطعا" گنجائش نہ ہو ....

صبح بیدار ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے آرام نہ ملا تھا......... بہت کم وقفے کے لیے اسے نیند آئی تھی......... اب وہ ہر قیمت پر اپنی اس منحوس بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا تھا......... اس کے ذہن میں ابھی تک کوئی کامل تدبیر نہ آئی تھی' مگر وہ مایوس نہ تھا۔ جانتا تھا ہمیشہ قدرت ایسے بے سہارا' مجبور اور مظلوم افراد کی مدد کرتی ہے۔

ابھی اس نے چائے کی پہلی چسکی ہی لی تھی کہ کلارامی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔

"فریڈ جلدی یہاں آؤ......... ایک بھڑ کمرے میں آ گئی ہے......... اسے مار ڈالو .... ورنہ یہ مجھے ڈنک مار دے گی......... جلدی آؤ فریڈ کے بچے........."

"خدا غارت کرے۔" اس نے چائے کی پیالی میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ "بھڑ ہے یا کوئی درندہ......... جو تمہیں پھاڑ کھائے گا......... چائے پی رہا تھا......... وہ بھی نصیب میں نہیں ...." وہ دوسرے کمرے میں گیا......... واقعی زرد رنگ کی ایک بڑی سی بھڑ بیرونی کھڑکی کے شیشے پر بیٹھی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ کلارامی کمرے کے ایک گوشے میں سہمی کھڑی تھی۔ فریڈ نے ایک اخبار اٹھا کر تہہ کیا اور ایک ہی ضرب سے بھڑ مار ڈالی' پھر احتیاط سے انگوٹھے اور پہلی انگلی کے ذریعے پکڑ کر اسے باہر فضا میں اچھال دیا۔ یہ کرتب اسے بھڑوں کے سیزن میں ہر سال نہ جانے کتنی مرتبہ دکھانا پڑتا تھا۔ اب تک ہزاروں ہی بھڑیں وہ مار چکا تھا اور خدا جانے ابھی کتنے برس یہی سلسلہ جاری رہنا تھا۔ ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہوا کہ کسی بھڑ نے اسے یا کلارامی کو ڈنک مارا ہو۔

مری ہوئی بھڑ کو باہر پھینک کر وہ دوبارہ جب اپنی نشست پر آن کر بیٹھا اور چائے کی دوسری چسکی لی تو ایک انوکھی تدبیر اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندی......... فریڈ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کا ہاتھ کانپا' اس نے جلدی سے پیالی پرچ میں رکھ دی......... اگر خدا نخواستہ پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر

جا گرتی اور ریزہ ریزہ ہو جاتی تو کلارامی اس کا کیا حشر کرتی؟ اس نے آپ ہی آپ خوش ہو کر اثبات میں کئی بار گردن ہلائی......... یہ ہے مکمل تدبیر......... جو کبھی پٹ پڑ ہی نہیں سکتی......... فرض کرو جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے' تو ایک بھڑکار میں داخل ہو کر اسے ڈنک مار دے......... اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یقیناً" وہ درد سے بدحواس ہو کر کار کی رفتار تیز کر دے گا اور یوں سامنے کھڑی ہوئی اس کی بیوی کچل کر ہلاک ہو جائے گی......... ایسا یقیناً" ہو سکتا ہے......... یہ حادثہ ہر طرح کے شبہے سے بالا ہو گا.........

اس تدبیر کے ذہن میں در آنے کی خوشی اتنی بڑھی کہ اس نے ناشتہ بھی پورا نہ کیا اور جلدی سے کوٹ پہن کر گیراج کی طرف دوڑا جہاں اس کی پرانی بوسیدہ سی کار کھڑی تھی۔ وہ دفتر پہنچ کر اطمینان سے' بالکل تنہائی میں اس تدبیر کے تمام پہلوؤں پر ہر رخ سے غور کر لینا چاہتا تھا۔ ایسی تنہائی اسے دفتر کے سوا اور کہیں میسر نہ آ سکتی تھی۔ پرانا ملازم ہونے کے باعث اسے ایک چھوٹا سا کمرہ الگ ملا ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی فریڈ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اس تدبیر پر غور کرنے لگا۔ جوں جوں سوچتا' اس سے بہتر' آسان اور فوری تدبیر کوئی اور سجھائی نہ دیتی۔ فریڈ کو ایسے بہت سے واقعات آہستہ آہستہ یاد آنے لگے جن میں کچھ ایسے ہی حادثے رونما ہوئے تھے۔ کار چلاتے چلاتے اچانک بھڑ نے ڈرائیور کے ڈنک مارا اور حادثہ ہو گیا۔ کسی بھی عدالت نے اس نوعیت کے حادثے پر ڈرائیور کو سزا نہ دی تھی۔

تمام دن وہ اس تدبیر پر عمل کرنے کی تفصیلات طے کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے یہ موسم ہی بھڑوں کی افزائش نسل کا تھا۔ کمال کی بات تو یہ کہ فریڈ کے سامنے ہی دو بھڑیں بھنبھناتی ہوئی بیرونی کھڑکی سے کمرے کے اندر داخل ہو گئیں اور ایک پرانی الماری کے اوپر بیٹھ کر نہ جانے کیا کرنے لگیں۔ وہ چپکے سے اٹھا اور بھڑوں کی طرف بڑھا......... طے کردہ تجاویز کے تحت اسے ایک بھڑ کو زندہ پکڑنا تھا۔

جونہی وہ آگے بڑھا' ایک بھڑ فوراً" اُڑ گئی۔ چند لمحے کمرے میں چکر کاٹنے کے بعد جدھر سے آئی تھی' اُدھر چلی گئی۔ دوسری بھڑ بدستور تختے سے سر جوڑے بیٹھی تھی۔ فریڈ نے اس کے پَر پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے کیا' یکایک بھڑ نے اس کی درمیانی انگلی میں ڈنک مارا اور اُڑ گئی۔ فریڈ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی انگلی میں دہکتی سوئی بھونک دی ہو۔ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل ہی گئی۔ آنکھیں باہر اُبل پڑیں' چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا اور انگلی کا یہ حال جیسے اس میں آگ جل رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے جہاں بھڑ نے ڈنک مارا تھا ایک ننھا سا سرخ دائرہ اُبھر آیا۔ چند منٹ بعد فریڈ کی انگلی خاصی سوج چکی تھی۔

اس تجربے کے لیے چونکہ ڈنک کے زہر کا لطف اٹھانا اس نے ضروری خیال کیا تھا' اس لیے فریڈ نے کوئی دوا وغیرہ لگانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اب اس تکلیف میں اسے مزا آنے لگا۔ شاید یہ سوچ کر کہ اس طرح وہ اپنی ظالم بیوی سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

حسبِ معمول شام کو جب وہ گھر گیا' تو گیراج کے باہر ہی کلارامی کھڑی نظر آئی۔ فریڈ نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہ خبر رساں ایجنسی مسز ہیکٹ بھی اپنے آنگن میں کرسی ڈالے موجود ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی ان میاں بیوی میں تکرار ہو گی اور وہ مزے سے سنے گی' پھر اگلے روز سارے محلے میں نشر کر دے گی۔ فریڈ اپنے منصوبے کے تحت اب مسز ہیکٹ کی اس عادت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

اس نے کار سے اترتے ہی کلارامی سے کہا۔

"آج تو غضب ہو گیا......... میں دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ ایک بھڑ چپکے سے آئی اور میری انگلی میں ڈنک مار کر غائب ہو گئی اور اس قدر تکلیف ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا......... خدا کی پناہ! میں نہ سمجھتا تھا کہ ان بھڑوں کے ڈنک میں اتنا زہر ہوتا ہے......... ساری انگلی سوج کر کپا ہو گئی یہ دیکھو........."

یہ جملے فریڈ نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہے تاکہ مسز ہیکٹ اچھی طرح

لی۔ یہ شہادت اس کے لیے بے حد قیمتی تھی اور اس نے حادثے کے اگلے روز عدالت میں گواہی دینی تھی۔

کلارامی نے سرسری طور پر فریڈ کی سوجی ہوئی انگلی پر نگاہ ڈالی اور بولی۔

"اب پتہ چلا تمہیں کہ یہ بھڑ کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ اگر کسی بھڑ نے اس مکان میں مجھے کاٹا تو اس کا ذمہ دار تمہیں قرار دوں گی......... سمجھے؟" اس کے لب و لہجے میں فریڈ کے لیے ہمدردی کے بجائے نفرت کے جذبات پوشیدہ تھے......... ویسے وہ اندر ہی اندر بیحد خوش ہو رہی تھی کہ فریڈ کو تکلیف پہنچی ہے۔ فریڈ نے بھی اس کی یہ اندرونی کیفیت بھانپ لی اور دل میں کہا۔ کوئی بات نہیں' آج ہی کا دن ہے' جتنا جی چاہے خوش ہو لو' کل خدا نے چاہا' تو تم اس کرۂ ارض کو گندہ کرنے کے لیے زندہ نہ ہو گی۔"

فریڈ اب بہت بے چینی اور اضطراب سے اگلے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ رات خوامخواہ ہی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ سورج نکلا تو وہ اطمینان سے نہایا' پھر ناشتہ کیا۔ اس دوران میں کلارامی کے طعن و تشنیع سے بھرے تیر برابر چلتے رہے' وہ جواب دینے کے بجائے مسکراتا ہی رہا۔ آخر عورت نے جل کر کہا۔

"میں دیکھتی ہوں ان دنوں تم مسکرانے بہت لگے ہو......... کہیں آنکھ تو نہیں لڑ گئی؟ یاد رکھنا اگر ایسی حرکت کی تو وہاں ماروں گی جہاں پانی نہ ملے۔

☆ ☆ ☆

وہ دفتر میں اپنے کمرے کے اندر بیٹھا بھڑ کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ باہر فضا میں بے شمار بھڑیں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں' لیکن کسی بھڑ نے اس کے کمرے کا رُخ نہ کیا' حالانکہ اس نے کھڑکی سے پردہ بھی پرے ہٹا دیا تھا اور بڑی کھڑکی کے علاوہ دائیں بائیں چھوٹی کھڑکیاں بھی کھول دی تھیں۔ بھڑ کا آنا اس کے منصوبے کی تکمیل کے لیے بے حد ضروری تھا۔ اگر بھڑ نہ آئی تو آج کا دن بھی ضائع ہو جائے گا۔ فریڈ نے سوچا اور شام کے چار بجے وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اب دفتر سے رخصت ہونے کا لمحہ

قریب آیا اس نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی........ عین اسی وقت ایک موٹی سی بھ
بھنبھناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ فریڈ خوشی سے یوں اچھلا جیسے اسے کوئین کی
دولت مل گئی ہو۔ اس نے لپک کر تینوں کھڑکیاں بند کر دیں تاکہ وہ باہر نہ جائے
پائے۔ خدا خدا کر کے بھڑ کو اس کی میز پر پڑی ہوئی ایک فائل پسند آئی اور وہ اس پ
بیٹھ گئی۔ فریڈ نے اپنے مقصد کے لیے پہلے ہی سے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ڈبیا ہاتھ
میں لے لی تھی۔ وہ بھڑ کو اس ڈبیا میں قید کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اس نے فائل پر بیٹھی ہوئی بھڑ کے اوپر ایک دم سے کھلے منہ کی ڈبیا رکھ دی، پھر فائل سمیت ڈبیا کو الٹ کر پھرتی سے ڈھکنا چڑھا دیا۔ زرد رنگ کی موٹی سی بھڑ اب ڈبیا میں بند ہو کر بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی، لیکن نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ فریڈ نے ڈبیا کا ڈھکنا اچھی طرح بند کر کے اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسے یقین تھا گھر تک پہنچنے میں جو پندرہ منٹ لگتے ہیں اس دوران میں یہ بھڑ مر نہیں جائے گی۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے شام اس کی کار رینگتی ہوئی اپنے گھر کے گیراج کے سامنے پہنچا کرتی تھی۔ کوئی نصف فرلانگ پہلے ہی سے اس نے دیکھ لیا کہ کلارامی باہر کھڑی ہے۔ وہ کچھ اور آگے گیا اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ حسبِ معمول مسز ہیکٹ بھی اپنی ڈیوٹی پر موجود ہے۔ اس نے جیب سے ڈبیا نکالی "کہاں کٹوانا مناسب رہے گا؟" اس نے سوچا "آنکھ کا نچلا حصہ نازک اور حساس ہوتا ہے۔ بس یہی جگہ مناسب ہے........" بھڑ سے اپنے آپ کو جان بوجھ کر کٹوانے کا مسئلہ تھا تو بہت ٹیڑھا اور تکلیف دہ، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ اس ذرا سی تکلیف کے بعد زندگی بھر کا عیش و آرام بھی تو فریڈ کے سامنے تھا۔

دھڑکتے دل سے اس نے بائیں ہاتھ سے ڈھکنا کھولا اور چہرے کے قریب لا کر بھڑ کو آزاد کر دیا۔ بھڑ اس قید سے جھلا کر آزاد ہوئی اور اس نے فریڈ کی بائیں آنکھیں کے بالکل نیچے ڈنک مارا۔ فریڈ کو اس قدر اذیت کی توقع نہ تھی۔ درد سے وہ چلا اٹھا

اور بے اختیار اس کا پاؤں ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ رینگتی ہوئی کار زناٹے سے آگے دوڑی۔ اس نے اپنی بیوی کے چیخنے کی آواز بہت واضح طور پر سنی......... کار اسے کچلتی ہوئی دھماکے سے گیراج کی دیوار کے ساتھ ٹکرائی......... فریڈ نے مسز ہیکٹ کے چلانے کی مسلسل آوازیں سنیں......... فریڈ کو زیادہ چوٹ نہ آئی تھی......... وہ جلدی سے باہر نکلا اور اپنی بیوی کو دیوانہ وار آوازیں دینے لگا جس کی خون میں لت پت لاش گاڑی کے اگلے بمپر سے چمٹی ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد سڑک پر آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ فریڈ اب بھی دیوانہ وار چلائے جا رہا تھا۔

"کلارا......... خدا کے لیے مجھے معاف کر دو......... مجھے بھڑ نے ایک دم کاٹ لیا......... میں کار پر قابو نہ پا سکا......... اُف خدایا.........! یہ کیا ہو گیا.........؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بری طرح رونے لگا۔ پاس پڑوس والے اسے تسلیاں اور دلاسے دے رہے تھے' لیکن وہ برابر روئے چلا جا رہا تھا......... اور دل ہی دل میں اپنے منصوبے کی کامیابی پر وہ بیحد خوش تھا......... سب لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اس کے چہرے کا بایاں حصہ بھڑ کے کاٹنے سے بری طرح سوج چکا ہے اور اس سوجن میں اس کی ایک آنکھ بھی چھپ گئی ہے......... پھر اچانک وہ ہانپنے لگا......... اسے اپنا سر گھومتا ہوا لگا......... اس کے کانوں میں آخری آواز مسز ہیکٹ کی آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آج پھر اسے بھڑ نے کاٹ لیا......... کل بھی ایسا ہی ہُوا تھا......... اس کی انگلی میں بھڑ نے ڈنک مارا تھا......... کل شام جب وہ دفتر سے واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے بھڑ کے کاٹنے کا ذکر کیا تھا......... بے چارا بد نصیب آدمی......... اور اب یہ حادثہ ہو گیا......... مَیں نے خود دیکھا کہ کار بے قابو ہو گئی اور اس کی بیوی جو ہمیشہ سے یہیں کھڑی ہوتی تھی' اس کے نیچے آ کر کچلی گئی........."

☆ ☆ ☆

اگلے روز کارونر کی عدالت میں اس مقدمے کی کارروائی ہوئی۔ کارونر
بتایا۔

"مسز ہیکٹ کا بیان ہے کہ اس حادثے سے ایک روز پہلے بھی بھڑ نے فریڈ
کی انگلی میں ڈنک مارا تھا اور اس کے زہر کی وجہ سے انگلی سوج گئی تھی......
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فریڈٹیز کے جسم میں اس زہر
خطرناک اثرات پیدا کر دیئے تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر دوبارہ اسے بھڑ نہ کاٹ
تو وہ بچ جاتا۔ بھڑ کا دوبارہ کاٹ لینا فریڈ کے لیے مہلک ثابت ہوا۔"

اس حادثے کے اٹھارہ ماہ بعد بھڑ اور اس کی نفسیات کے موضوع پر ایک ما
علم الحیوانات کی ضخیم کتاب شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب کا انتساب یوں کیا۔

"اپنی مرحومہ خالہ کلارامی ٹیز کے نام جن کی وجہ سے میں یہ کتاب مرتب
کرنے کے قابل ہو سکا۔"

کاش! اس گراں قدر کتاب کے مؤلف کو معلوم ہوتا کہ کتاب کی اصل تالیف
کا باعث کون تھا؟ خالہ یا اس کا شوہر؟

*

بے گناہ مجرم

1960ء شمسی کے موسم گرما کی ایک شام تھی۔ چونتیس سالہ جان ٹارمن اپنے مالک کے ساتھ مچھلی کے شکار سے لوٹا تو تھک کر چور تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے حصے میں آئی ہوئی ایک بڑی مچھلی بیوی کے سامنے پھینکی اور اپنے بستر پر دھڑام سے گر پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند کی آغوش میں تھا۔ اس کی بیوی کورا کام کاج سے فارغ ہو کر خواب گاہ میں آئی' لیکن اس نے شوہر کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ کھانا کھا کر وہ بھی اپنے پلنگ پر سو گئی۔

آدھی رات ہوئی تھی کہ زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آوار سن کر میاں بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران تھے کہ اس وقت کون انہیں تنگ کرنے آ گیا۔ کورا دروازہ کھولنے گئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا کہ چار لمبے تڑنگے' چاق چوبند آدمی اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں ایک مقامی خفیہ پولیس کا آدمی تھا اور تین ریاست ورجینیا کی خفیہ پولیس کے افسر تھے۔ تینوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ہیرے کی انگوٹھی' سونے کی گھڑی اور جوتوں کا جوڑا فورا'' ہمارے حوالے کر

دو۔"

جان اور کورا اس غیر متوقع حملے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دو آدمی آگے بڑھے اور انہوں نے جان کو بستر سے گھسیٹ لیا۔ اسے شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے کی مہلت بھی نہ دی اور دھکے دیتے ہوئے باہر لے گئے۔ باقی دو آدمیوں نے مکان کی تلاشی لینی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے سجے سجائے گھر کو تلپٹ کر دیا۔ کورا چپ چاپ کھڑی تھی۔ اسے صرف باہر کار چلنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد خفیہ پولیس کے آدمی اسے بھی دھکے دیتے ہوئے باہر لے گئے اور دوسری کار میں دھکیل دیا۔

اس رات جو کچھ ہوا' وہ امریکہ کے محکمۂ سراغ رسانی کے ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والا داغ ہے۔ فیر فیکس کے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں جسمانی اذیت اور بہیمیت کا جو انسانیت سوز ڈرامہ کھیلا گیا' اس کی صدائے بازگشت آج بھی امریکہ میں گونج رہی ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ دنیا کو درس انسانیت دینے والے اور بنیادی حقوق کی آزادی کے سب سے بڑے دعوے دار ملک میں سترھویں صدی کے پیورٹین دور اقتدار کی اس بربریت کو کیوں کر روا رکھا گیا۔ اس بہیمانہ ڈرامے کی ابتدا جس میں پولیس کے علاوہ ماہرین نفسیات اور عدالت نے بھی حصہ لیا' 11 جون 1959ء کو ہو چکی تھی۔ اگر جان کے مالک ٹی' جے' ہنری اور دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر جوزف ڈیو نیجر کی کوشش سے نوجوان وکیل وین' ای' کو مر اور امریکہ کی شہری آزادی کی تنظیم نے مداخلت نہ کی ہوتی تو بے گناہ جان ٹارمن کو ذہنی عذاب اور جسمانی اذیت دے کر مار ڈالنے میں کوئی کسر چھوڑی نہ گئی تھی۔

جان پر ایک ٹرک ڈرائیور کیرل' وی' جیکسن' اس کی بیوی ملڈ ریڈ' دو بیٹیوں' چار سالہ سوسن اور سترہ ماہ کی جینیٹ کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ یہ الزام ثابت کرنے کے لیے سراغ رسانی اور تفتیش کے جدید اور مروجہ طریقے استعمال کرنے کے بجائے صدیوں پرانے جادو گری کے طریقۂ کار کا سہارا لیا گیا۔ اس پر ساری مہذب دنیا تڑپ اٹھی۔ وکلا نے ہنگامہ برپا کر دیا' اخبارات نے اداریئے لکھے اور اس طرح

اکیس دن تک جہنم میں رہنے کے بعد جان کو آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔

11 ر جنوری 1959ء شمسی کی رات ٹرک ڈرائیور جیکسن' بیوی بچوں سمیت' اپنی ساس سے مل کر ورجینیا کے جنوب مشرق میں اپیل گرو کے مقام پر اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی گھر نہ پہنچا۔ اگلے دن خالی ٹرک رچمنڈ سے تقریباً" تیس میل دور ایک شاہراہ پر ملا۔ ٹرک چلانے کے لیے چابی کو جلا دیا گیا تھا۔ اگلی نشست پر ملڈریڈ کا خالی پرس ملا اور پچھلی نشست پر بچے کے دودھ کی بوتل' گڑیا اور دوسری چیزیں......... مقامی حاکم ضلع ولیس' آر' پروفٹ نے کئی سو آدمیوں پر مشتمل ایک کھوجی پارٹی کے ساتھ میلوں علاقہ چھان مارا' لیکن گم شدہ خاندان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک راہ گیر نے بتایا کہ اس نے رات کی تاریکی میں ٹرک یا کار کی بتیوں کی روشنی دیکھی تھی اور اس کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی متعدد بار آواز سنی تھی' معلوم نہیں کیا ہو رہا تھا۔

پولیس نے تفتیش شروع کر دی' لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ آخر یکم مارچ کو فریڈ رکسبرگ کی لکڑی چیرنے کی ایک بند مل کے قریب بھوسے کے ڈھیر تلے' جیکسن اور چھوٹی لڑکی کی لاشیں مل گئیں۔ جیکسن کے سر میں 38ء بور کے پستول کی گولی کا گہرا زخم تھا اور سوا سال کی جینیٹ کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ اس کے سترہ دن بعد ہی واشنگٹن اور بالٹی مور کے وسط میں واقع ایک چھوٹے سے قصبے میری لینڈ سے کچھ دور ایک سنسان مقام پر ملڈ ریڈ اور سوسن کی لاشیں بھی مل گئیں۔ انہیں بری طرح زدو کوب کیا گیا تھا۔

مرکزی محکمۂ سراغ رسانی نے مقامی خفیہ پولیس کے تعاون سے 1475 مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ کی کہ وہ واردات کی رات کو کہاں تھے۔ جیکسن کے والدین میری لینڈ کے قریب گیمبرلس میں رہتے تھے۔ وہ ان سے ملنے اکثر جاتا تھا۔ چوں کہ اس علاقے میں ملڈ ریڈ اور سوسن کی لاشیں ملی تھیں' لہٰذا اسے بھی شامل تفتیش کر لیا گیا'

لیکن معمولی پوچھ گچھ کے بعد اسے 1340 افراد سمیت چھوڑ دیا گیا۔ اب خفیہ پولیس کی توجہ کے مرکز 135 افراد رہ گئے تھے' جن کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

جان اس واقعے کو بھول گیا اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا' لیکن اسے علم نہ تھا کہ تقدیر کھڑی مسکرا رہی ہے اور اس نے ایک گم نام' بے مایہ ٹرک ڈرائیور کا مستقبل عالمی شہرت کے مالک دو اشخاص کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ ان میں ایک مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر ایف' ریجن' ترسمین تھا' جو سینٹ الزبتھ میں دماغی امراض کے ہسپتال سے منسلک اور امریکی ماہرین نفسیات کی انجمن کا سرگرم رکن تھا۔ دوسرا 49 سالہ ولندیزی پیٹر ہرکوس تھا۔ یہ شخص علم روحانیت اور انسانی ذہن پڑھنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے غیب کے متعلق جتنی باتیں بتائی تھیں' وہ حیرت انگیز طور پر صحیح تھیں۔ ان دنوں وہ امریکہ کا دورہ کر رہا تھا اور چند ماہ پیشتر واشنگٹن میں ٹیلی ویژن پر بھی پروگرام پیش کیا تھا۔ ترسمین نے محکمہ سراغ رسانی کو تجویز پیش کی کہ "جیکسن قتل" کے معمے کو حل کرنے کے لیے ہرکوس کی خدمات حاصل کی جائیں۔ پولیس والے اس سے سرکاری طور پر رابطہ قائم کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن ترسمین نے اپنے طور پر سو ڈالر یومیہ مع اخراجات پر ہرکوس کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ اس سے واشنگٹن کے ہوائی اڈے پر ملا۔ وہ اپنے ساتھ دو درجن افراد کی تصویریں لے گیا تھا۔ ہرکوس نے ایک تصویر چھانٹ لی اور کہا کہ یہ اس شخص کی تصویر ہے' جو ذہنی خلفشار کا شکار ہے۔ دو سال سے بیمار ہے اور اس کی عمر 83 سال ہے۔ تصویر ترسمین کے باپ کی تھی اور اس کے متعلق ہرکوس نے جو کچھ بتایا تھا' سو فی صد صحیح تھا۔ ہرکوس نے دوسرے لوگوں کو بھی سچ باتیں بتائیں۔ اس نے مقامی پولیس کے سربراہ ایڈورڈ ہمپس کو بتایا کہ اس کی شادی تیرہ سال قبل ہوئی تھی۔ ایک افسر کو ٹھیک بتایا کہ اس کی بیوی عین اس وقت کیا کر رہی تھی۔ چار دوسرے افسروں کو ان کی زندگی بھر کے حالات سچ سچ بتائے۔

اسی طرح ایک اخبار نویس کو گزشتہ دس برسوں کے واقعات بتا دیئے۔ سب اس کی غیر معمولی غیبی طاقت کے معترف تھے۔ امور دولتِ مشترکہ کے قانونی مشیر فزجیرالڈ نے اسے "حیرت انگیز" شخص قرار دیا۔ آرلنگٹن کے جج پال' ڈی' براؤن نے اسے "چونکا دینے والا" شخص کہا۔

ہرکوس دوسروں کے ذہن میں چلنے والی "فلم" دیکھنے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اس کا طریقۂ کار انوکھا تھا۔ ملزم کو سامنے بٹھا کر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھتا اور بتاتا کہ اس نے جرم کیا ہے یا نہیں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق پولیس جائے واردات پر پہنچتی اور جرم کا سراغ مل جاتا۔ اس نے ٹیلی ویژن انٹرویو میں اور اخباری رپورٹروں کو بتایا کہ اس کا طریقۂ کار بالکل سیدھا سادھا ہے۔ پولیس اسے جائے واردات پر لے جاتی۔ وہاں پہنچ کر وہ قطعی خالی الذہن ہو جاتا اور اسے ریڈیو کی لہروں کی طرح برقی پیغامات ملتے۔ بقول اس کے یہ پیغامات اس کے تحت الشعور سے آتے۔

ہرکوس کی مقبولیت کے باوجود بہت سے سائنس دان' ڈاکٹر اور ماہرین نفسیات اس کے علم غیبی اور روحانیت کے دعویٰ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہتے کہ خفیہ پولیس نے جرائم کی تفتیش میں ناکامی کو چھپانے کے لیے اسے ساتھ ملا لیا ہے۔ جب کوئی عقدہ حل نہیں ہوتا تو اس کی روحانی طاقت کی آڑ میں بے گناہ لوگوں کو پھانس لیا جاتا اور انہیں مجرم ثابت کر دیا جاتا۔ خفیہ پولیس والے اسے کسی شخص کے متعلق پہلے ہی بتا دیتے اور وہ اس کے ماضی اور حال کے واقعات بلا کم و کاست بتا دیتا۔ کئی مشہور سائنس دانوں' ڈاکٹروں' ماہرینِ نفسیات اور وکلا نے ہرکوس کا امتحان لینا چاہا' لیکن وہ مقررہ وقت پر کبھی نہ پہنچتا۔ اس کے مداح' جو زیادہ تر خفیہ پولیس کے آدمی تھے' اسے آزاد منش' لاابالی اور بے پروا کہتے تھے۔ تاہم یہ ہتھکنڈے بڑے شہروں میں کامیاب نہیں تھے۔ قصباتی حکام اور پولیس والے ہی ان سے کام لیتے تھے۔ لیکن کب تک؟ جیکسن خاندان کے قتل میں بے گناہ جان کو ملوث کرتے ہی واشنگٹن میں وہ ہنگامہ مچا کہ ہرکوس کو ملک چھوڑتے ہی بنی۔ اس وقت تک اس نے نہ جانے کتنے

بے گناہوں کو سزا دلا دی تھی اور کتنے ہی خاندانوں کو تباہ کر دیا تھا اور نہ معلوم کتنے مجرم قانون کے شکنجے سے بچ نکلے تھے۔

7 جون 1960ء سمٹی کو فالس چرچ پہنچتے ہی ہرکوس نے اخباری رپورٹروں کو بتایا کہ جیکسن خاندان کے قتل کا معما حل ہو جائے گا۔ اسی دن اس نے اپنا یومیہ مشاہدہ سو ڈالر مع اخراجات وصول کر لیے۔ وہ ورجینیا پولیس کے ساتھ سیدھا فریڈ رکسبرگ گیا' جہاں سے جیکسن اور جینیٹ کی لاشیں ملی تھیں۔ وہاں وہ دیر تک بیٹھا خلا میں گھورتا اور فلم دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ "مجرم" نے چار سے زیادہ افراد قتل کئے ہیں۔ غالباً" نو......... تاہم اس نے مجرم کی نشاندہی نہیں کی۔ اگلے دن وہ میری لینڈ گیا' جہاں جیکسن کی بیوی اور بڑی لڑکی کی لاشیں پائی گئی تھیں۔ وہاں بھی وہ اسی طرح بیٹھا "فلم" دیکھتا رہا۔ مجرم کے متعلق اس نے پہلی مرتبہ بتایا کہ وہ لکی اسٹرائیک سگریٹ پیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی قیام گاہ پر جانے لگا۔ وہ ہمیشہ نو سے بارہ گھنٹے تک سویا کرتا تھا۔ پولیس والوں اور اخباری رپورٹروں کے اِصرار پر اس نے صرف اتنا کہا کہ اسے مجرم کا علم ہو گیا ہے۔ اگلے دن اس نے خفیہ پولیس اور سراغرسانوں کی سترہ ماہ کی الجھن دور کر دی۔ مجرم کا جو حلیہ اس نے بتایا وہ ہو بہو جان سے ملتا جلتا تھا۔

فیرفیکس کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں لے جانے کے بعد جان کو اس کے دو بھائیوں اور وکیل سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ پولیس والے اس سے صرف "ہاں" کہلوانا چاہتے تھے۔ دوسرے کمرے میں ملڈ ریڈ تھی' لیکن دونوں کو اس جگہ ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ پانچ گھنٹوں کے تھکا دینے والے' پریشان کن سوالات کے بعد ملڈ ریڈ کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے گھر کے قریب کار رکنے کی آواز سنی اور اس میں سے جان کو اترتے دیکھ کر اس کے زرد' مضمحل چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ کچھ دیر سو لینے کے بعد جان کام پر چلا گیا۔

سارا دن کسی سے بات کیے بغیر وہ اپنا کام کرتا رہا۔ مال لانے لے جانے کے

لیے کئی پھیرے کیے۔ اسے علم نہ تھا کہ خفیہ پولیس کے آدمی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس عذاب سے نجات پا چکا ہے۔ وہ اس اذیت ناک رات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتا تھا۔ شام کو گھر لوٹ رہا تھا کہ ایک پولیس ویگن نے اس کا راستہ روک لیا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔" حکم ملا۔

"اور یہ ٹرک؟" اس نے پوچھا۔

"اسے یہیں چھوڑ دو۔" دوسرا حکم ملا۔

وہ پھر فیرفیکس پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ گزشتہ رات بھر کا جاگا ہوا اور آج پھر جاگنا تھا۔ وہی عذاب اور اذیت تھی، لیکن وہ قاتل ہوتا تو اقرار کرتا! اس نے تو جیکسن کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، لیکن ہرکوس کی "فلم" اسے مجرم ثابت کر چکی تھی۔

دوسرے کمرے میں کورا پھر ان پریشان کن سوالات سے دوچار تھی۔

"تمہارا شوہر نیم پاگل ہے؟" پوچھا گیا۔

"قطعی نہیں۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"تم جانتی ہو اس نے تقریباً نو افراد کو قتل کر دیا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"اسے سزائے موت ہو گی تب یقین آئے گا۔"

"اچھا اگر اسے سزائے موت دلانے کے بجائے چند دنوں کے لیے میرین بھیج دیا جائے تو کیسا رہے گا؟" اس کی رائے طلب کی گئی۔ کورا کو کیا معلوم تھا کہ میرین کیا بلا ہے۔

"اس کا جرم ثابت ہو چکا ہے، لیکن تم اسے موت سے بچا سکتی ہو۔" ہمدردی جتائی گئی۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"اس فارم پر دستخط کر دو۔" ایک فارم اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔

"میں کسی سے مشورہ کیے بغیر کسی فارم پر دستخط نہیں کروں گی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس کی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دیئے ہیں۔" کرخت جواب ملا۔

"نہیں نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اسے میرین بھیج دو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ چند دنوں میں واپس آ جائے گا۔" کسی نے اس کے شانوں پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

اگلی شب جان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج جے میسن گرو مسند انصاف پر بیٹھا تھا۔ یہ عدالت دراصل تحقیقاتی کمیشن کا کام کر رہی تھی۔ ٹرسمین' جیل کا ڈاکٹر جیس' آر' کور اور دولت مشترکہ کا قانونی مشیر رابرٹ' سی' فزجیرالڈ اراکین تھے۔ ہال تفتیشی افسر تھا۔ جوزف ڈینیٹ نامی ایک وکیل کو جان کا قانونی مشیر مقرر کیا گیا۔ جان نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جوزف نے تمام کارروائی کے دوران میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ ٹرسمین نے باقی دو اراکین کو بتایا کہ جان کا باپ اور ماں دونوں شرابی تھے۔ باپ نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ ہال نے بتایا کہ جیکسن اور اس کے بیوی بچوں کو جان نے ہیرے کی انگوٹھی اور سونے کی گھڑی' نقدی نہ جانے کتنی تھی' کے لیے قتل کر دیا ہے۔ فزجیرالڈ نے کوئی بات نہیں کی' صرف اثبات میں سرہلاتا رہا۔ کورا اور جوزف خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ٹرسمین نے کورا کا دستخط کردہ فارم جج کے سامنے پیش کیا۔ ساری کارروائی میں صرف پندرہ منٹ لگے اور جج کے فیصلے کے مطابق جان کو میرین (ورجینیا) کے مجرموں کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا۔

پاگل خانے میں اسے پاگلوں کا مخصوص لباس دیا گیا اور ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ہر روز اسے دوسرے مجرم پاگلوں کے ساتھ کوٹھڑی سے

نکالا جاتا اور ایک بڑے ہال میں لے جایا جاتا۔ یہاں پتھر کی بنچوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ساتھی اسے عجیب و غریب حرکتوں سے ڈراتے اور مار ڈالنے کی دھمکی دیتے۔ وہ ہر وقت سہما سہما رہتا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات وہ تھے' جب اس کے دماغ کو بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے ہوش ہو جاتا۔ چودہ دن اسی طرح گزر گئے۔ پاگلوں اور خطرناک مجرموں میں رہ کر اس کا ذہن ماؤف ہو چلا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ایک دن وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا۔ وزن گھٹ کر آدھا رہ گیا تھا اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد......... دراصل اسے سسک سسک کر مرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

جان کا مالک ہنری نہیں چاہتا تھا کہ اچھا بھلا اور بے گناہ آدمی پاگل بن کر مجرم ہونے کا داغ لیے مر جائے۔ اس نے کورا اور جان کے بھائیوں سے مشورہ کیا اور ایک نوجوان اور ہوشیار وکیل وائن' ای' کومر کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے یہ معاملہ امریکہ کی شہری آزادی کی تنظیم کے سامنے پیش کیا' ساتھ ہی عدالت سے مطالبہ کیا کہ مقدمے کی دوبارہ سماعت کی جائے' کیونکہ عدالت کی کارروائی آدھی رات کو بلا وجہ ہوئی تھی اور اس میں کوئی وکیل یا عام آدمی شریک نہیں ہوا تھا۔ شہری آزادی کی تنظیم نے وزارت انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تنظیم کے اراکین کے مشورے سے کومر نے میرین کے ایک وکیل جی' آر' سی' اسٹوارٹ اپنے ساتھ شریک کر لیا اور اسٹوارٹ نے عدالت عالیہ میں جان کے حق میں ہیبس کارپس کی درخواست داغ دی۔ اب تک واشنگٹن کے لوگ اس اندھیر نگری سے واقف نہیں تھے۔ شہری آزادی کی تنظیم نے رائے عامہ کو اس طرف متوجہ کیا۔ اخبارات نے شور مچا دیا۔ "ڈیلی نیوز" نے اس سزا کو سترہویں صدی کی یادگار قرار دیا۔ ریڈیو پر ایک اخبار کا اداریہ پڑھ کر سنایا گیا' جس میں عدالت کی کارروائی اور فیصلے کو انصاف کے ماتھے پر بدنما داغ کہا گیا تھا۔ عدالت عالیہ نے ہیبس کارپس کی درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی۔

یہاں سے بہت دور ویسٹ میمفس، آرکنسس میں پیانو کمپنی کا ایک سیلز مین 31 سالہ میلون ڈیوس رلیس تین سال قبل میری لینڈ کی ایک عورت کو قتل کر کے فرار ہو جانے کے الزام میں پکڑا گیا۔ اس کے والدین ورجینیا میں ہیائس وِلے میں رہتے تھے۔ تفتیش کے دوران میں اس کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی۔ وہاں میلون کی ڈائری ہاتھ لگی، جس میں چھ افراد کے قتل کی مکمل تفصیل درج تھی۔ ان میں چار جیکسن خاندان کے لوگ تھے۔ 38ء بور کا ایک پستول بھی ملا جس سے جیکسن کے سر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

ہیبس کارپس کی درخواست کی سماعت سے ایک ہفتے پہلے ہی جان کو چھوڑ دیا گیا۔

*

کمرہ نمبر ۳۱۲

منگل کی ایک سرد شام کو سام ویبسٹر حسب معمول حساب کتاب دیکھنے اور رقم وصول کرنے آیا۔ اس کے منہ میں موٹا سا سگار دبا تھا جس کی بَد بُو فضا میں آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی پرانی عینک کے شیشے دُھندلے سے تھے......... اس نے آتے ہی شیلٹن کی طرف گردن سے اشارہ کیا۔ کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور حساب کتاب کا رجسٹر کھول کر اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں سگار بجھ گیا۔ سام نے سگار دوبارہ جلایا۔ تیزی سے چار پانچ گہرے کش لیتے ہوئے کہا۔

"شیلٹن تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے؟"

"تیس برس۔" شیلٹن نے جاسوسی کہانیوں کے رسالے سے گردن اٹھا کر جواب دیا۔

"خوب' خوب۔" سام کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا۔ اور اب تیس سال بعد تم نے حساب کتاب میں گڑ بڑ کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔ تمہارا خیال ہے میں تمہیں مناسب معاوضہ ادا نہیں کرتا؟"

"مسٹر سام' میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" شیلٹن نے حیرت سے کہا۔

"میں خود بھی نہیں سمجھا شیلٹن' یہ معاملہ کیا ہے۔" سام نے کہا۔ "گزشتہ چند مہینوں سے برابر دیکھ رہا ہوں' رقموں کے اندراج میں توازن نہیں۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں' ایک یہ کہ تم رقم خرد برد کر رہے ہو یا پھر مسافر واجبات ادا کیے بغیر بھاگ جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے سچ سچ بتا دو۔"

"جناب! صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میں چور نہیں۔" شیلٹن نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ کو ایسا سوچنا بھی نہ چاہیے۔"

"بے شک میں خود حیران ہوں۔ تم چور اُچکے تو لگتے نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ رقم کہاں غائب ہو رہی ہے۔ بس یہ سمجھا دو مجھے۔"

یہ کہہ کر سام نے وہسکی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹ غٹ آدھی بوتل ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دی۔ شیلٹن خاموش رہا۔ سام چند لمحے غور سے اس کی طرف تکتا رہا اور پھر بولا۔ "اگر تم نہ بتاؤ گے تو مجھے مجبوراً" آڈیٹروں کو تکلیف دینا ہو گی۔ بلا سے کچھ رقم اور ہاتھ سے جائے گی لیکن پتہ تو چل جائے گا آخر گڑ بڑ کہاں ہے۔"

شیلٹن بدستور چپ رہا۔

"کچھ کہتے کیوں نہیں۔ کیا گونگی کا گڑ کھا لیا ہے تم نے؟" سام نے جھلا کر کہا۔

شیلٹن نے گھبراہٹ کے مارے' بولنے سے پہلے دو تین مرتبہ کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "دیکھیے مسٹر سام' پہلے معاملہ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسافر پیشگی کرایہ ادا کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے بہت سوں سے اس معاملے پر گالیاں تک کھائی ہیں اور کبھی آپ کو خبر تک نہ دی۔ بعض لوگ واجبات ادا کیے بغیر ہی نکل جاتے ہیں........."

شیلٹن کا اتنی دیر میں گلا خشک ہو گیا۔ اس نے کولر سے گلاس میں پانی لیا اور دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "کمرہ نمبر 312 کا معاملہ بھی پریشانی کا باعث ہے۔ پچھلے

ایک سال سے......... میں خود آپ سے کہنے والا تھا........"

"کیا ہوا کمرہ نمبر312 کو؟" سام نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "پی میں رہا ہوں، بہک تم گئے۔ ارے بے وقوف! میں پوچھتا ہوں جو مسافر واجبات ادا کیے بغیر کھسک جاتے ہیں' آخر وہ اپنا سامان تو چھوڑ جاتے ہوں گے۔ وہ چیزیں کہاں ہیں؟ انہی کو بیچ باچ کر ہم اپنا خسارہ پورا کر سکتے ہیں۔"

"جناب! وہی تو میں آپ سے عرض کر رہا تھا۔" شیلٹن نے قدرے بلند آواز میں کہا اور اپنی پیشانی پر پھوٹنے والے پسینے کے قطرے رومال سے پونچھنے لگا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کس طرح آپ کو سمجھاؤں دیکھئے' صاف صاف بات یہ ہے کہ جو مسافر کمرہ نمبر312 میں رات گزارتا ہے' صبح کو غائب پایا جاتا ہے اور سامان بھی ندارد۔"

سام ویبسٹر نے کھا جانے والی نظروں سے شیلٹن کو دیکھا' کچھ کہے بغیر اس نے وہسکی کی بوتل اٹھائی' دو گھونٹ پیئے' پھر سگار کے چند کش لگائے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شیلٹن' میں تمہیں تیس برس سے جانتا ہوں' ایسی بے سروپا باتیں تم نے پہلے کبھی نہ کی تھیں۔ سچ سچ بتاؤ آج کل کون سا نشہ کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو کمرہ نمبر312 میں ٹھہرنے والے مسافر بھی غائب' اس کا سامان بھی غائب۔ یہ کیا بکواس ہے آخر؟"

"بالکل ایسا ہی ہے جناب! میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔" شیلٹن نے اصرار سے کہا۔ "مسافر بھی غائب' اس کا سامان بھی ندارد۔ ہر چیز اس طرح ناپید جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا اور یہ حادثہ صرف کمرۂ نمبر312 میں ان مسافروں کے ساتھ ہوتا ہے جو رات دو بجے سے پہلے اس کمرے میں پہنچ جاتے ہیں۔ خدا جانے زمین نگل لیتی یا آسمان کھا جاتا ہے۔ غالبا" کوئی جن بھوت یا آسیب اس میں ہے۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔" سام نے شیلٹن کو گھور کر دیکھا۔ "اور یہ پتہ نہیں چلتا مسافر اور اس کا سامان گیا کہاں؟"

"جی ہاں۔ میں نے اب تک جتنے مسافر رات دو بجے سے پہلے کمرہ نمبر312 میں

بھیجے' ان میں سے ایک کا بھی سراغ نہ ملا اور نہ ان میں سے کسی کو دوبارہ دیکھا۔ یہ
وجہ ہے میں اب کسی مسافر کو اس کمرے میں قیام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

سام وبسٹر کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"شیلٹن' میرا خیال ہے تمہیں بہت جلد پاگل خانے میں داخل ہونا پڑے گا۔"

"اوہ خدایا! کاش میں پاگل ہوتا!" شیلٹن نے بیزاری سے کہا۔ "کیا میں نے
پہلے کبھی آپ سے غلط بیانی کی؟ بخدا جو کچھ میں نے کہا' حرف بہ حرف سچ ہے۔ یقین
نہ آئے تو خود آزما کر دیکھ لیجئے۔ آج رات آپ یہیں ہوٹل میں رہیے' میں کسی
مسافر کو کمرہ نمبر312 میں قیام کے لیے بھیجوں گا۔ پھر خود دیکھ لیجئے۔ صبح وہ کمرے میں
پایا جاتا ہے یا نہیں۔"

سام وبسٹر نے ٹیلی فون اٹھایا' ڈائل پر اپنے گھر کے نمبر گھمائے اور بیوی سے
کہا۔

"آج رات میں گھر نہ آسکوں گا۔ یہاں ہوٹل میں کچھ گڑبڑ ہے۔ نہیں نہیں
گھبرانے کی بات نہیں........" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"شیلٹن' میں آج رات یہیں رہوں گا۔ میرا اب بھی خیال ہے تم نے اوٹ
پٹانگ جاسوسی اور ڈراؤنی کہانیاں' ان بے ہودہ رسالوں میں سے پڑھ پڑھ کر اپنا ذہن
ماؤف کر لیا ہے۔ ورنہ جو کچھ تم کہتے ہو' ایسا کبھی سنا نہ دیکھا۔ بہرحال ایک رات کی
بے آرامی ہی سہی۔ اچھا میں ذرا کھانا کھا لوں۔ اور دیکھو' جب تک میں کھانا کھا کر نہ
آ جاؤں کسی مسافر کو کمرہ نمبر312 میں جانے نہ دینا۔"

شیلٹن نے اثبات میں گردن ہلائی۔

سام جب واپس آیا تب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ شیلٹن اس دوران
میں جو رسالہ پڑھ رہا تھا' اس کی آخری کہانی ختم ہو چکی تھی۔ اب اس نے بھی کاغذ
میں لپٹا ہوا بڑا سا سینڈوچ نکالا اور آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ سام نے ایک بار پھر بھیگا
ہوا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا' کرسی پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولے' ٹائی کی گرہ ذرا

ڈھیلی کی اور جیب سے تازہ سگار نکال کر سلگایا۔

ٹھیک آٹھ بجے ایک نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرنے آیا۔ شیلٹن نے انہیں نچلی منزل کے ایک ڈبل بیڈ کمرے کی چابی دی۔ ساڑھے آٹھ بجے دو سیلز ایجنٹ آئے۔ شیلٹن نے انہیں کسی اور کمرے میں بھیجا۔ نو بجے ایک لمبا تڑنگا اوباش آدمی ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے قیمتی اوور کوٹ پہن رکھا تھا' شراب کے نشے میں دھت۔ اس عالم میں اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

"کوئی کمرہ خالی ہے؟"

شیلٹن نے جلدی سے کمرہ نمبر312 کی چابی اسے تھمائی۔

"مہربانی فرما کر تین ڈالر کرایہ پیشگی ادا کر دیجئے۔"

مسافر نے چابی لے کر شیلٹن کو ایک غلیظ گالی دی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دو منٹ بعد سام اپنی کرسی سے اٹھا اور مسافر کے پیچھے پیچھے گیا۔ کمرہ نمبر312 تیسری منزل پر سب سے آخر میں تھا۔ اس نے دیکھا مسافر نے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر گیا اور پھر دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ سام مطمئن ہو کر نیچے کاؤنٹر پر آ گیا۔

رات کے ڈیڑھ بجے تک وہ برابر جاگتا رہا۔ اس دوران میں اس نے آٹھ سگار پیئے۔ اس کی نگاہیں بار بار دیوار پر لگے ہوئے بڑے کلاک پر جم جاتیں۔ شیلٹن نے سبز رنگ کے تھرماس میں سے اپنے لیے کافی برآمد کی اور مزے سے چسکیاں لینے لگا۔

دو بج کر پانچ منٹ ہو گئے۔

سام نے کرسی پر پہلو بدلا اور شیلٹن سے کہا۔

"دو بج چکے اور ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔"

شیلٹن مسکرایا۔ "جناب' بہت کچھ ہو چکا ہو گا۔ میرا خیال ہے وہ مسافر اب کمرے میں نہ ہو گا۔ جی چاہے' تو جا کر دیکھ لیجئے۔"

"آؤ چل کر دیکھیں۔" سام اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کمرے کے اندر ہرگز نہ جاؤں گا۔" شیلٹن نے کہا۔

"مت جانا' مگر ساتھ تو چلو۔" سام نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا وہ مسافر غائب ہو چکا ہو گا اور اگر ایسا ہوا تو بخدا یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا حیرت انگیز واقعہ ہو گا۔"

وہ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ سام کا سانس پھول گیا۔ اب وہ کمرہ نمبر312 کے سامنے کھڑے تھے۔ دوسری چابی سام کے ہاتھ میں تھی۔

"شیلٹن ایک بار پھر سوچ لو' جو کچھ تم نے کہا' وہ کہاں تک صحیح ہے۔ ایسا نہ ہو یہ مسافر بے آرام ہو اور ہمیں مادر پدر بکے۔"

"جناب' مجھے پورا یقین ہے مسافر غائب ہو چکا ہے۔"

سام نے دھڑکتے دل سے دروازے کے اندرونی قفل میں چابی گھمائی۔ دروازہ ہلکی آواز سے کھلا۔ سام نے ذرا احتیاط سے اندر جھانکا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ دھکیلا' پھر بھی کچھ نہ دکھائی دیا۔ اس نے کمرے میں گھس کر روشنی کا بٹن دبا دیا۔

کمرہ بالکل خالی تھا۔

سام نے بستر کی طرف دیکھا۔ چادر پر شکنیں پڑی تھیں۔ صاف لگتا تھا کوئی وہاں سویا ضرور ہے۔ اس نے چادر پر ہتھیلی رکھی۔ بستر ابھی تک گرم تھا' مگر مسافر کہاں گیا؟ اس کا اوورکوٹ بھی غائب اور جوتے بھی۔ سام نے پلنگ کے نیچے دیکھا' الماری کے پیچھے جھانکا' باتھ روم میں نظر دوڑائی کہیں سراغ نہ ملا۔

سام کا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا........ آخر وہ گیا کہاں؟" اس نے حد درجہ حیرت سے کہا۔ ایک بار پھر کمرے کا گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا۔ کوئی کونا کھدرا باقی نہ چھوڑا جیسے وہ مسافر چھ فٹ کا آدمی نہیں کوئی چوہایا چھپکلی تھا۔ بے خیالی میں وہ اسی بستر پر بیٹھ گیا' پھر

یوں اچھلا جیسے زبردست بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ شاید اسے ڈر تھا کہیں وہ بھی غائب نہ ہو جائے۔

"آؤ چلیں۔" اس نے شیلٹن سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔

وہ دونوں ہانپتے کانپتے نیچے اپنے دفتر میں آئے۔ سام نے جلدی سے دوسری بوتل نکالی ۔ تھرتھراتی انگلیوں سے کاک الگ کیا اور ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر اسے نصف بھر لیا اور شیلٹن کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو شیلٹن' ہماری مشترکہ کامیابی کا پہلا جامِ مسرت قبول کرو۔"

"میں سمجھا نہیں مسٹر سام' جام مسرت کا یہ کیا موقع ہے؟"

ہاہا۔ تم نہیں سمجھ سکتے........." سام نے ہنس کر جواب دیا۔ "جو آئیڈیا میرے زرخیز دماغ میں آیا ہے' تم قیامت تک اس کا تصور نہیں کر سکتے' بیوقوف شیلٹن۔"

اس نے ایک بار پھر بوتل منہ سے لگا لی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں پولیس کو اس قصے سے آگاہ کر دینا چاہیے۔" شیلٹن نے کہا۔

"پولیس؟" سام بوتل خالی کر کے ایک گوشے میں پھینکتے ہوئے چیخا۔ "پولیس؟ آخر پولیس کا اس سے کیا واسطہ؟ یہ کوئی قتل ہے یا ڈکیتی کا کیس؟ ارے جاہل' احمق' تجھے معلوم نہیں ہم نے کتنی بڑی دریافت کی ہے! کتنی عظیم!" سام کا چہرہ مارے خوشی اور جوش کے تپے ہوئے تانبے کی مانند سرخ ہو گیا۔ "پولیس کو طلب کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ تم اپنی بیوی کو اطلاع دو اور اس سے کہو ابھی تمہیں یہاں کچھ کام ہے لہٰذا تم گھر نہ پہنچ سکو گے۔ وہ خوامخواہ انتظار نہ کرے۔"

"میں اپنی بیوی کو فون نہیں کر سکتا، مسٹر سام۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میری بیوی ہے ہی نہیں۔"

"شیلٹن' مجھے صدمہ ہُوا یہ سن کر۔ کیا ہارٹ فیل ہوا اُس کا یا بیمار تھی، بیچاری؟"

"شیلٹن کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔"

"نہیں مسٹر سام' اس کا ہارٹ فیل ہوا نہ وہ بیمار تھی۔ میں خود اس سے بُری طرح اکتا گیا تھا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"کیا قتل کر دیا تم نے اسے؟" سام نے بوکھلا کر پوچھا۔

"نہیں' مسٹر سام' میں نے اسے ایک رات کمرہ نمبر312 میں ٹھہرانے پر راضی کر لیا تھا۔"

سام وِبسٹر نے بے انتہا خوش ہو کر داد دینے کے انداز میں شیلٹن کی پیٹھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔

"خدا رحم کرے شیلٹن! تم تو جینئس نکلے۔"

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا' مسٹر سام۔ میں جینئس کیسے ہو گیا؟"

"ارے گدھے' تم ذرا سوچو تو اس عظیم دریافت سے ہم کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف بے شمار نفوس ایسے ہیں جو کسی نہ کسی سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ ہم منہ مانگے معاوضے پر کمرہ نمبر312 کی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ بس اس میں چند گھنٹے قیام کرنا شرط ہے۔ اس کے بعد مردہ غائب' نہ رگڑا نہ جھگڑا' نہ پولیس کا چکر، نہ موت کی کرسی کا خوف' کتنے شوہر ہیں جو اپنی آوارہ بیویوں سے نجات پانا چاہتے ہیں، کتنی بیویاں ہیں جو اپنے لفنگے شوہروں کی زندگی سے اکتا گئی ہیں! کتنے لوگ ہیں جو اپنے کبھی نہ مرنے والے رشتے داروں کے بنک بیلنس اور ورثے پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں! یہاں ہر شخص کسی نہ کسی سے چھٹکارا پانے کی فکر میں ہے' اس لیے پیشہ ور قاتلوں کی بڑی مانگ ہے' مگر قتل وغیرہ کے دھندے ہیں خطرناک۔ وہی پولیس کا چکر' اور ہمارے ہاں ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔ جس کا جی چاہے فیس داخل کرے' کمرہ بک کرائے اور جسے ہمیشہ کے لیے غائب کرانا مقصود ہو اسے اس کمرے

میں بھیج دیا جائے۔ یقین کرو شیلٹن کمرہ نمبر312 کی بزنس اس قدر شاندار رہے گی کہ ہمارے پاس دولت کے انبار لگ جائیں گے۔ لوگ مہینوں پہلے سے بکنگ کرایا کریں گے۔"

"مگر......... مگر جناب......... یہ سارا معاملہ بہرحال قتل کی واردات ہی میں گنا جائے گا۔"

"قتل؟ کون کہتا ہے یہ قتل کی وارداتیں ہوں گی؟" سام نے جھنجلا کر کہا۔ "قتل تو تب ہو گا جب پولیس غائب ہونے والوں کی لاشیں دریافت کرے گی۔ یہاں نہ لاش ملے گی، نہ قتل کا جرم ثابت ہو سکے گا۔ لاش تو ایک طرف جو فرد اس کمرے میں قیام کرے گا' اس کی ایک چیز بھی دستیاب نہ ہو گی۔ بہرحال میں نے طے کر لیا ہے اس بزنس میں بیس فی صد تمہارا حصہ ہو گا۔ بولو' اب تو خوش ہو؟"

"بیس فی صد! فیاضی کی انتہا ہے مسٹر سام......... میں وعدہ کرتا ہوں محنت سے کام کروں گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔" سام نے خوش ہو کر کہا۔ "ممکن ہے تمہاری خدمات سے متاثر ہو کر میں کبھی تمہیں کاروبار میں نصف کا شریک کر لوں۔ خیر اب دھندا شروع کرنے سے پہلے میں اس منحوس عورت ہلڈا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات پانا چاہتا ہوں۔"

"ہلڈا کون؟"

"وہ چھنال۔" سام نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میری بیوی ہے اور کون ہوتی؟ یوں سمجھو اس سرزمین پر اس سے بدتر عورت اور کوئی نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کل رات ہی اسے کمرہ نمبر312 میں بھیجنے کا انتظام کر لوں۔"

"اتنی جلدی؟" شیلٹن نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں آپ مزید غور کر لیں ؟

"ہرگز نہیں۔" سام چلایا۔ "میں اب اس منحوس کو ایک لمحے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کل اس بزنس کا افتتاح اسی سے ہو گا۔ سمجھے؟ میں بہرحال اسے کل

رات 312 میں بھیج دوں گا۔ خواہ مجھے اس کی کھوپڑی میں ہتھوڑا مار کر اسے بے ہوش ہی کرنا پڑے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ اگلے روز رات کے ٹھیک دس بجے سام و یلبسٹر اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل میڈیسان میں آیا۔ شیلٹن ان دونوں کو دیکھ کر مسکرایا اور اس نے لیڈی سام کو شب بخیر کہا۔ کئی برس بعد وہ اس عورت کو ہوٹل میں قدم دھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مسٹر سام نے بڑی محبت سے بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بس یوں سمجھو ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے اور اب ہم ہنی مون کی تیاریوں میں ہیں۔ میں نے اپنے ہوٹل کا ایک کمرہ اسی مقصد کے لیے الگ کرلیا ہے۔ چند روز یہاں رہیں گے۔ خوب عیش کریں گے۔" اس نے قہقہہ لگا کر نئی بوتل ڈیسک کے اندر سے برآمد کی اور شیلٹن کی طرف دیکھ کر بڑی صفائی سے آنکھ کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے پے بہ پے کئی جام خود ڈکارے اور کئی بیوی کو پلائے۔ اس کی ادھیڑ عمر بیوی بُری طرح شرما رہی تھی۔

سام نے اسے کمرہ نمبر312 کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

"لو جان من، تم کمرے میں چل کر ذرا آرام کرو۔ میں تھوڑا سا حساب کتاب کر کے ابھی آیا۔"

بیوی کو موت کے کمرے میں روانہ کر کے سام بے حد خوش ہوا۔ مزید ایک گھنٹہ وہ شیلٹن کے ساتھ آئندہ بزنس کا پروگرام بناتا رہا۔ پہلی بوتل ختم ہوئی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سام انگڑائی لے کر اُٹھا۔

"میں ذرا اس بوڑھی بندریا کو دیکھ آؤں کس حال میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کمرے سے نکل بھاگے اور خوامخواہ آج کی رات ضائع ہو۔" اس نے پھر شیلٹن کو آنکھ سے اشارہ کیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بالائی منزل پر پہنچا۔ کمرہ نمبر312 کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے اس کی بیوی کے خراٹوں کی بھیانک آواز آ رہی تھی۔ سام دبے قدموں مطمئن ہو کر نیچے آ گیا۔

"وہ جوانی کی نیند سو رہی ہے۔" اس نے شیلٹن کو بتایا۔ "خراٹوں کی آواز ایسی ہے جیسے لوکل ٹرین چل رہی ہو۔ کمرے پر زلزلہ سا طاری ہے۔ بخدا میں ان خراٹوں سے بھی عاجز آ چکا ہوں۔ اف! زندگی کے وہ تیس سال جو میں نے اس بُھتنی کی رفاقت میں کاٹے ہیں' ایک ناقابلِ برداشت عذاب تھا میرے لیے۔ اور اب چند گھنٹوں بعد اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک سمجھو۔ شیلٹن یار' اگر یہ عورت واقعی غائب ہو گئی تو اس خوشی میں تم کو ایک ہفتے کی تنخواہ بطورِ بونس زائد دوں گا۔"

"فکر نہ کیجئے مسٹر سام۔ اب آپ اپنی بیوی کی صورت کبھی نہ دیکھیں گے۔"

جونہی کلاک نے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا' سام جھرجھری لے کر اٹھا اور کمرہ نمبر312 کی طرف چلا۔ شیلٹن اپنے ڈیسک ہی پر موجود رہا۔ دس منٹ بعد سام خوشی سے اُچھلتا کُودتا نمودار ہُوا۔ مسرت کے جذبے سے اس کا بُرا حال تھا۔ ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر وہ دُور ہی سے چلایا۔

"غائب......... بالکل غائب......... وہ بوتل بھی غائب جو ہلڈا کے پاس تھی۔ اُف!......... کہیں میں خوشی سے مر نہ جاؤں۔ ارے شیلٹن! ذرا سوچو تو......... اب میں کبھی اپنی بیوی کا منحوس چہرہ نہ دیکھوں گا۔ آہا ہا........."

سام نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا، شیلٹن پیارے۔"

اگلے روز سام نے اپنے ایک پرانے دوست لوئیس کرویل کو فون کیا۔

"کہو یار' کیا حال چال ہیں......... ہاں ہاں میں ٹھیک ٹھاک ہوں......... تمہاری بیوی کیسی ہے؟ اگر تمہیں فرصت ہو تو آ جاؤ......... کچھ بزنس کا معاملہ ہو گا......... ممکن ہے میں تمہاری پریشانی ہمیشہ کے لیے دور کر دینے کا انتظام کر دوں......... ہاں ہاں......... ایسا کرو......... دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھاؤ۔ پھر ہم اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

اور اس رات ہوٹل میڈیسان میں مسٹر لوئیس اور ان کی بیوی قیام کے

ارادے سے آئے۔ لوئیس نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ سام کا ارادہ یہ ہوٹل بیچ دینے کا ہو رہا ہے اور وہ چاہتا ہے ہم ایک دو راتیں اس ہوٹل میں اس کے مہمان کی حیثیت سے گزاریں۔ بارہ بجے کے فوراً بعد سام نے کمرہ نمبر312 کی چابی لوئیس کی بیوی کو دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو نیند آ رہی ہو گی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچئے۔ آپ کے شوہر ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے پینے پلانے کا چھوٹا سا دَور چل جائے۔"

عورت لڑکھڑاتی ہوئی چلی اور سیڑھیاں چڑھ کر چند لمحوں بعد ان کی نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔ لوئیس نے آہستہ سے کہا۔

"سام! تمہیں پورا یقین ہے میں اِس بلا سے آج رات ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے والا ہوں۔ دیکھو ذرا احتیاط سے کام کرنا۔ ایسا نہ ہو یہ عورت کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

سام نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔

"ارے یار' تم بالکل فکر نہ کرو۔ جب دو بجے ہم اس کمرے میں جائیں گے تو وہاں تمہاری بیوی کا نام و نشان تک نہ ہو گا۔ اگر وہ کپڑے اتار کر سوئے گی تو نہ اس کے کپڑے ملیں گے نہ اُس کا جوتا۔ جو چیز اس کے ساتھ ہے وہ بھی غائب ہو جائے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو!" لوئیس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اس عورت نے میری زندگی جہنم بنا دی ہے' سام۔ اگر آج رات یہ غائب ہو گئی تو یہی سمجھوں گا میں نے دوبارہ زندگی پائی۔"

یکایک کسی خیال کے زیرِ اثر اس نے کہا۔

"مَیں پولیس کے چکر میں آنا پسند نہ کروں گا۔ یہ سوچ لو تم لوگ۔"

سام نے سخت بیزاری سے اپنے دوست کو دیکھا۔

"یار کہہ تو دیا تشویش کی کوئی بات نہیں۔ پولیس کا یہاں کیا کام؟ تم خود دو بجے

کے بعد کمرہ نمبر312 میں جا کر دیکھ لینا' تمہیں اطمینان ہو جائے گا۔ اب مناسب یہ ہے کہ تم بھی تھوڑی دیر کے لیے یہیں کہیں لیٹ کر آرام کر لو' شیلٹن تمہیں ٹھیک دو بجے بیدار کر دے گا۔"

☆ ☆ ☆

اگلے روز صبح نو بجے لوئیس دو بارہ ہوٹل میڈیسان میں داخل ہوا۔ سام اور شیلٹن دونوں اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ لوئیس نے جیب سے پھولا ہوا ایک بند لفافہ نکال کر سام کی طرف بڑھایا۔

"سام' یہ حقیر نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے' اس کے مقابلے میں اس معمولی رقم کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کی پناہ! مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا وہ موذی عورت غائب ہو چکی ہے' جسے دنیا میری بیوی کی حیثیت سے جانتی پہچانتی تھی۔"

سام نے لفافہ کھولا۔ سو سو ڈالر کے دو بل اس میں سے برآمد ہوئے۔ شیلٹن نے للچائی ہوئی نگاہوں سے یہ رقم دیکھی۔ سام نے اسی وقت بیس فی صد شیلٹن کے حوالے کیا۔ اس دھندے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دوست سے کہا۔

"لوئیس تمہارا حلقہء احباب خاصا وسیع ہے۔ امید ہے تم ہماری اس نئی بزنس کا اپنے دوستوں میں ذکر کرو گے۔ ہر شخص مناسب معاوضے پر ہماری خدمات حاصل کر سکتا ہے۔"

"بے شک تم دیکھنا میں کس قدر کام تمہیں بھجواتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس دھندے میں آگے بڑھنے کے بے شمار مواقع ہیں۔ دراصل کمرہ نمبر312 کی دریافت اس صدی کی غالباً" سب سے عظیم دریافت ہے۔"

سام کی چھاتی فخر سے کئی انچ چوڑی ہو گئی۔ اس کے انداز سے یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے اس کے گھوڑے نے ڈربی ریس جیت لی ہو۔

"سام' تم خود عظیم آدمی ہو۔" لوئیس نے کہا اور سام نے یوں گردن ہلائی

جیسے وہ واقعی اپنے آپ کو عظیم سمجھتا ہو۔

ایک ماہ کے اندر اندر کمرہ نمبر312 کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ سام کو ایک رات کی بکنگ فیس دو سو ڈالر سے بڑھا کر دو ہزار ڈالر کر دینی پڑی۔ اس کے باوجود کمرہ بک کرانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سام کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ وہ ضرورت مندوں کو تین تین چار چار ماہ کی تاریخیں دینے لگا۔ شیلٹن کی بھی پانچوں گھی میں تھیں اور سر کڑاہی میں۔ اس کی آمدنی اتنی کہ گننے کی بھی فرصت نہ تھی۔

ایک روز شیلٹن اپنی ڈیوٹی پر آیا ہی تھا کہ بھورے بالوں اور غمزدہ آنکھوں والا ایک دبلا پتلا نوجوان ہوٹل میڈیسان میں آیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے خوب رویا ہو۔

"مسٹر شیلٹن! کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں مسٹر سلاٹر' تم ایک ماہ پہلے یہاں آئے تھے۔ کیا تمہیں کمرہ نمبر312 بک کرانے کی پھر ضرورت پڑ گئی؟"

"جی نہیں۔" نوجوان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔" اب میں چاہتا ہوں میری بیوی مارتھا واپس آ جائے۔ سمجھے آپ؟ میں آپ کو دوبارہ اتنی ہی فیس دینے کے لیے تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ میری بیوی مجھے دوبارہ مل جائے۔"

شیلٹن حیرت سے نوجوان کا منہ تکنے لگا' پھر اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے مسٹر سام نے تمام صورت حال تم پر بخوبی واضح کر دی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بہرحال میری بیوی واپس آنی چاہیے۔ میں مسٹر سام کو عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ باتیں بنانے میں ماہر ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان کا یہ دھندا جائز ہے یا ناجائز۔ میں اپنے ساتھ رقم لے کر آیا ہوں۔ میری بیوی مارتھا کو واپس آنا چاہیے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

شیلٹن نے لرزتے ہاتھوں سے فون اٹھایا اور سام سے کہا۔

"مسٹر ویبسٹر' ذرا جلدی سے ہوٹل میں آئیے۔ ایک عجیب مسئلہ پیدا ہو گیا۔"

بیس منٹ کے اندر اندر سام وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سلاٹر کو نہیں دیکھا۔

"کیا بات ہے شیلٹن' خیر تو ہے؟ کیا کمرہ نمبر312 کی بکنگ کا کوئی مسئلہ ہے؟ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ فیس اور بڑھا دی جائے۔"

"دیکھئے' مسٹر سلاٹر دوبارہ تشریف لائے ہیں۔ ذرا ان کی بات سنئے۔"

سام نے گھوم کر سلاٹر پر حیرت کی نظریں ڈالیں۔

"اوہ! تم ہو۔ بولو کیا قصہ ہے؟ کیا اس مرتبہ اپنی کوئی اور معشوقہ غائب کرانا چاہتے ہو؟ بخدا یہی بات ہو گی مگر یار' میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو تمہارا کام ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ بس کم از کم ایک ہفتے تک انتظار کرنا ہو گا۔ بڑا رش ہے آج کل۔"

سلاٹر گردن جھکائے یہ لیکچر سنتا رہا۔ جب سام نے بکواس بند کی تو اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"مسٹر سام' آپ غلط سمجھے۔ میری کوئی معشوقہ نہیں جسے غائب کرانا مقصد ہو۔ میں تو اپنی بیوی مارتھا کے لیے یہاں آیا ہوں۔ چاہتا ہوں وہ واپس آ جائے۔"

بے اختیار سام کا ہاتھ ڈیسک کے اندر رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل کی طرف بڑھ گیا۔

"دیکھو میرے بھائی' یہ ناممکن ہے، سمجھے؟ میں نے تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب تم کہتے ہو ہم مارتھا کو واپس لائیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔"

سلاٹر نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے جتنی جی چاہے فیس لیجئے اور مارتھا کو واپس لائیے۔"

"بیوی؟" سام نے کہا۔ "ارے بے وقوف! بیوی کے پیچھے روتے تمہی کو دیکھا ہے۔ اب میں اسے کہاں سے لاؤں؟ مجھے تو خود پتہ نہیں وہ کہاں گئی۔ کیوں شیلٹن' اب ہم اسے دوبارہ لا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں۔" شیلٹن نے جواب دیا۔

سلاٹر چند لمحے خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ پھر اس نے ایسے لہجے میں جس میں دھمکی کا عنصر نمایاں تھا' سام سے کہا۔

"دیکھو غور سے میری بات سنو۔ اگر کل رات دس بجے تک میری بیوی واپس نہ آئی تو میں پولیس سے سارا حال کہہ دوں گا۔"

سام نے کھا جانے والی نظروں سے سلاٹر کو دیکھا۔

"کیا تم پاگل ہو گئے؟ پولیس اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟ ہم نے تمہاری بیوی کو قتل نہیں کیا۔ اور پھر سوال یہ ہے' تمہاری باتوں پر یقین کون کرے گا؟ ذرا سوچو جب تک پولیس کو غائب ہونے والوں کی لاشیں نہ ملیں وہ ہم پر قتل کا مقدمہ کیسے بنائے گی؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" سلاٹر نے زور سے کہا۔ "کل رات دس بجے تک مارتھا کو میرے گھر میں ہونا چاہیے۔ خواہ تم نے اسے غائب کیا یا قتل کر دیا' میں کچھ نہیں جانتا۔"

یہ کہہ کر وہ آنسو پونچھتا ہُوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

سام نے الماری کھول کر وہسکی کی نئی بوتل نکالی اور شیلٹن سے کہنے لگا۔

"دیکھا تم نے اس احمق کو؟ پہلے خود ہی بیوی کو غائب کرا دیا اب کہتا ہے اسے واپس لاؤ۔ سمجھ میں نہیں آتا لوگوں کو آج کل کیا ہو گیا ہے۔ ان کی عقلیں گھاس چرنے چلی گئیں۔" اس نے شراب کے چند گھونٹ بھرے' پھر بائیں آستین سے منہ پونچھ کر بولا۔ "اور اس کم بخت مارتھا کو دیکھا تھا نا تم نے؟ کیسی بَدصورت لڑکی تھی۔ دیکھنے سے متلی ہوتی تھی۔ منہ چلاتی تو یوں لگتا جیسے بھینس جگالی کر رہی ہو۔ ایسی لڑکیوں پر مرے ہوئے ہیں یہ آج کل کے نوجوان؟ بہرحال وہ پولیس کے پاس جائے یا جہنم میں......... مجھے پروا نہیں۔ شیلٹن چھوڑو اس قصے کو' یہ بتاؤ کمرہ نمبر312 کی بکنگ کا کیا حال ہے؟"

"لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں مسٹر سام' بہت سوں کو تو میں نے انکار کر دیا۔ ابھی تین ماہ تک کوئی رات خالی نہیں۔"

"گویا تین ماہ تک ہم نرخ نہیں بڑھا سکتے؟ یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جن لوگوں نے پیشگی رقمیں ادا کر دیں ہیں ہم انہیں بکنگ ختم کرنے کی دھمکی دے کر مزید پیسے بٹور لیں؟ غرض مند ویسے بھی دیوانہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ داؤ چل جائے گا۔ ذرا آزما کر تو دیکھو۔"

دوسرے دن شام کو شیلٹن نے دیکھا کہ سلاٹر پھر ہوٹل میں آ رہا ہے۔ شیلٹن خود اس کا انتظار کر رہا تھا' کسی نہ کسی طرح یہ قضیہ طے پا جائے۔ سلاٹر نے آتے ہی شیلٹن سے پوچھا۔ "امید ہے میرے مسئلے پر تم لوگوں نے غور کیا ہو گا۔"

"اس میں غور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں مسٹر سلاٹر۔ آپ کی بیوی اب کبھی واپس نہ آ سکے گی۔"

عین اسی لمحے سام وبلسٹر ادھر آ نکلا۔ اس نے شاندار سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں بیش قیمت چھڑی اور نہایت عمدہ سگار اس کے ہونٹوں میں دبا تھا۔ سلاٹر کو دیکھے بغیر اس نے شیلٹن سے کہا۔ "کیا حال چال ہے۔ آج کی بکنگ پر عمل ہو گیا؟"

"جی ہاں' آج رات مسٹر کوپر کی بیوی کے لیے کمرہ بک ہے۔"

"شکر ہے اس سُور عورت کا کام بھی تمام ہُوا۔" سام نے کہا۔ "مَیں اس شخص کوپر کی بیوی کو عرصے سے جانتا ہوں۔ اس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ بخدا! اگر یہ عورت کوپر کے بجائے میری بیوی ہوتی تو میں اسے قتل کر کے اب تک موت کی کرسی پر بیٹھ چکا ہوتا۔ یہ کوپر ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ اتنے دن اس کے ساتھ نبھا گیا۔" یکایک اس کی نظر سلاٹر پر پڑی۔ اس نے سلاٹر کی کمر پر محبت سے گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

"آ گئے بیوی کے عاشق........ آؤ میرے ساتھ چلو میں تھیٹر دیکھنے جا رہا ہوں۔ سنا ہے وہاں دو تین پریاں قیامت کی آئی ہوئی ہیں۔ میں کوشش کروں گا ایک

آدھ سے تمہارا تعارف کرا دوں۔ پھر تم اس بے وقوف مارتھا کو بھول جاؤ گے۔"

"نہیں مسٹر سام' مجھے پریوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" سلاٹر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے صرف مارتھا چاہیے۔"

سام یک لخت از حد سنجیدہ ہو گیا۔ چند ثانیے سلاٹر کو دیکھنے کے بعد اس نے ہونٹ بھینچ کر کہنا شروع کیا۔

"میں اب تک تم سے شرافت کے لہجے میں بات کرتا رہا' مگر تم وہی مرغے کی ایک ٹانگ رٹے جاتے ہو۔ جاؤ یہاں سے دفان ہو جاؤ' پولیس کے پاس جاؤ یا فوج کے......... جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ' مجھے کسی حرامی کی پروا نہیں۔ تم خود اپنی بیوی کو غائب کرانے کے جرم میں ہمارے برابر کے شریک ہو۔" اس نے سگار کے دو تین گہرے کش لیے۔ "بہتر یہ ہے تم اچھے بچوں کی طرح مان جاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔ اگر تمہیں اپنی رقم واپس چاہیے تو شیلٹن کو اجازت ہے۔ تمہیں پانچ سات ڈالر زیادہ ہی دے دے گا اور اگر تم نے ہمیں مزید تنگ کیا تو یاد رکھو میں تمہیں پکڑ کر کمرہ نمبر 312 میں بند کر دوں گا۔ پھر تم بھی مارتھا کے پاس پہنچ جاؤ گے......... بولو کیا کہتے ہو؟"

سلاٹر کی آنکھیں ویران اور خشک تھیں۔ اس نے نفی میں کئی بار گردن کو جنبش دی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

سام ویبسٹر اور شیلٹن کا مشترکہ دھندا زوروں پر تھا۔ روپے کی گویا بارش ہو رہی تھی۔ کئی بار سام نے سوچا کاش! اس کے پاس کمرہ نمبر312 کی طرح کے کئی اور کمرے ہوتے جن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ افراد غائب کرائے جا سکتے مگر افسوس!......... انہوں نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ اتنے افراد اپنی بیویوں' شوہروں' ساسوں' باپوں' نانیوں' دادیوں اور سوتیلی ماؤں سے اکتائے ہوئے ہیں اور ان سے پیچھا

چھڑانے کے متمنی ہیں۔ سام کی آہنی تجوری کرنسی نوٹوں سے بھر چکی تھی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ایک اور تجوری خرید لینی چاہیے۔ شیلٹن کے پاس بھی بے پناہ دولت جمع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بادشاہوں کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ سام نے اس دوران میں ہوٹل میں بہت سے نئے کمروں کا اضافہ کر دیا اور نوکروں کی تعداد دگنی ہو گئی۔ شیلٹن نے اپنے لیے بہت شاندار آفس بنالیا اور اب اس نے جاسوسی کہانیوں کے رسالے پڑھنے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ سام نے اپنی پرانی چھکڑا کار بیچ کر بیش قیمت رولز رائس کار خرید لی۔ وہ روز نیا سوٹ پہن کر ہوٹل میں آتا۔ اس کے دائیں بائیں خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا مجمع رہنے لگا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کا تذکرہ آئے دن ہوتا' اس کی تصویریں خوب چھپتیں۔ ایک آدھ بار کسی فلمی ایکٹریس کے ساتھ اس کے رومان کا چرچا بھی ہوا' مگر سام ان باتوں سے کبھی خوش نہ تھا۔

ستمبر کی ایک اداس رات تھی جب پہلی بار ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ شیلٹن اپنے آفس میں بیٹھا گرم گرم قہوے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ سام ویبسٹر وہاں آیا۔ اس روز بھی اس نے بے داغ سوٹ پہن رکھا تھا اور بغل میں حسبِ معمول شمپیئن کی بوتل۔ اس کا چہرہ از حد سنجیدہ...... آفس میں آکر اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور شیلٹن کی طرف دیکھنے لگا۔ شیلٹن نے محسوس کیا کہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خوف کا ایک گہرا تاثر بھی سام کی آنکھوں میں موجود ہے۔

"خیر تو ہے مسٹر سام' آپ خاصے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

"یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا...... میری تو عقل چکر میں ہے۔"

"آخر ہوا کیا؟ کچھ تو کہیئے؟" شیلٹن بھی پریشان ہو گیا۔

"ابھی ابھی میں دو رقاصاؤں کے ساتھ گروف تھیٹر میں گیا تھا۔" سام نے کہنا شروع کیا۔ "تم جانتے ہو نا ان دونوں کو؟ وہی میرے دائیں بائیں تھیں۔ دراصل تھیٹر والوں نے آج ایک نئے کھیل کا اعلان کیا اور میں اسے ہر قیمت پر دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم نے اگلی قطار کے ٹکٹ لیے اور جا کر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ تماشا شروع ہونے سے پیشتر

معمول کے مطابق سٹیج پر چند رقاصاؤں نے رقص پیش کیا اور پھر میں نے اسے بھی ان رقاصاؤں میں شامل دیکھا۔ بالکل وہی تھی۔ مَیں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"کون تھی وہ جسے آپ نے دیکھا؟" شیلٹن نے مضطرب ہو کر کہا۔

"ہلڈا......... وہ ہلڈا تھی......... میری بیوی......... مگر حیرت یہ ہے وہ بالکل نوجوان نظر آ رہی تھی......... آج سے تیس سال پہلے جیسی۔ بس ویسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔"

"مسٹر سام' آپ کو دھوکا ہوا۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔"

"ہرگز نہیں........." سام نے کہا۔ "میری آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ یقیناً" ہلڈا تھی۔ کیا تم مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ میں اپنی بیوی کو نہیں پہچان سکتا؟ اس کے بائیں گھٹنے پر تل تھا' وہ بھی میں نے دیکھ لیا۔ اُف خدایا' کیا یہ ممکن ہے؟ وہ بالکل ویسی ہی تھی' جب میں نے تیس سال پہلے اس سے شادی کی تھی۔ ہلڈا کی ہمیشہ سے بہترین رقاصہ بننے کی آرزو تھی۔ وہ کہا کرتی تھی اگر اس نے مجھ سے شادی کی حماقت نہ کی ہوتی تو وہ رقاصہ بن کر عظیم شہرت حاصل کرتی......... اور اب......... وہ واقعی بہترین رقاصہ بن چکی ہے......... کیا تم نے سوچا شیلٹن کہ جس قدر افراد بھی کمرہ نمبر312 سے غائب ہوئے ہیں' شاید سبھی ایسے تھے جو اپنی زندگی میں وہ کچھ نہ بن سکے جس کی انہیں آرزو تھی اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی کہیں غائب نہیں ہُوا......... وہ سب اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں نئے سرے سے لگ رہے ہوں گے۔ یہ تصور کتنا دل خوش کن اور نفیس ہے!"

وہ کسی ان جانے تصور میں ڈوب گیا۔ دفعتہً" شیلٹن نے کہا۔ "مسٹر سام میں پھر کہتا ہوں' آپ فریبِ نظر کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ آپ کی بیوی ہلڈا نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں وہ ہلڈا تھی۔ مجھے اس کا ایسے ہی یقین ہے جیسے اس بات کا یقین کہ تم

میرے سامنے موجود ہو۔"

سام نے شمپیئن کی بوتل ختم کر ڈالی۔ یکایک کسی خیال کے تحت اس کا چہرہ دمکنے لگا اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ایسا نظر آتا تھا وہ ابھی اپنی کرسی سے اٹھ کر دیوانہ وار ناچنا شروع کر دے گا۔

"شیلٹن، خدا کی قسم! میں نے پالا مار لیا۔" وہ چلّایا۔ "حیرت ہے ایسا بے نظیر خیال میرے ذہن میں پہلے کیوں نہ آیا۔ بہرحال دیر آید درست آید۔ جب نہیں تو اب سہی۔"

شیلٹن نے خوف زدہ نگاہوں سے سام کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا بک رہا ہے۔

"کون سا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے، مسٹر سام؟"

"آ ہا ہا........." سام نے قہقہہ لگایا۔ "میری خواہش تھی کہ میں فٹ بال کا عظیم کھلاڑی بنوں۔ لاکھوں افراد کی نظریں کھیل کے میدان میں صرف مجھی پر جمی ہوں۔ آہ! شیلٹن بخدا میں تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرے سٹیڈیم میں گیند لیے دوڑ رہا ہوں......... لوگ دیوانہ وار گلا پھاڑ پھاڑ کر داد دے رہے ہیں۔ ان کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں......... میں نے میچ جیت لیا ہے شیلٹن......... لوگ اب مجھ سے آٹوگراف لینے کے لیے ٹوٹ پڑے ہیں......... آ ہا ہا........."

شیلٹن نے بے بسی سے اپنے باس کو دیکھا۔ سام نے شراب کی نئی بوتل غٹا غٹ چڑھانی شروع کی۔ اس کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ شیلٹن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے پھر تقریر شروع کی۔ انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"جب میں بچہ تھا، اس وقت سے لے کر اب تک زندگی میں صرف ایک ہی آرزو کی تھی کہ میں فٹ بال کا کھلاڑی بن جاؤں، لیکن افسوس اس آرزو کے پورا ہونے کا موقع ہی نہ ملا، مگر اب......... کوئی شخص، سام و یبسٹر کو اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنے سے نہیں روک سکتا......... اب پورے امریکہ میں ہر شخص کی زبان پر

صرف سام و یبسٹر کا نام ہو گا......... آ ہا ہا ہا......... پھر لڑکیاں ہی لڑکیاں......... عورتیں ہی عورتیں......... اُف......... کیا منظر ہو گا وہ بھی......... پریس رپورٹر' فوٹو گرافر......... فلمیں بنانے والے سب میرے آگے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے......... میں کسی کے ہاتھ نہ آؤں گا......... میں......... فٹ بال کا عظیم کھلاڑی......... سام و یبسٹر......... بین الاقوامی شہرت کا مالک......... بڑے بڑے لوگ مجھ سے ہاتھ ملانا فخر سمجھیں گے......... شیلٹن' اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔"

"مسٹر سام' کیا آپ ایک رات کمرہ 312 میں قیام کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں؟" شیلٹن نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"اور میں اتنی دیر سے کیا بکواس کر رہا ہوں؟ بے وقوف......... گدھے........." سام چیخا۔ جلد بتاؤ آج رات یہ کمرہ کس کے نام پر بک ہے؟"

شیلٹن نے رجسٹر دیکھ کر جواب دیا۔ "مسٹر اور مسز گرین والڈ کے نام پر۔"

"ابھی اس شخص گرین والڈ کو فون کرو۔" سام نے کہا۔ "اور اس سے کہو کہ آج رات کے بجائے کل رات اپنی بیوی کو لے کر آئے......... سمجھے؟ میں کوئی عذر نہیں سننا چاہتا۔ یہ ہوٹل' میری ملکیت ہے......... کمرہ نمبر312 کا مالک مَیں ہوں۔ اب مَیں گھر جا رہا ہوں......... تھوڑی دیر آرام کروں گا......... اور بارہ بجے سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا......... میرے آنے تک ہر اعتبار سے تیار ہو جانا چاہیے۔"

شیلٹن کو حیران پریشان چھوڑ کر اس نے اپنی چھڑی سنبھالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

رات کے بارہ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھی کہ سام و یبسٹر کی رولز رائس' ہوٹل میڈیسان کے دروازے پر رکی۔ وہ ہنستا مسکراتا دفتر میں آیا۔ شیلٹن نے دیکھا کہ اس کا باس تازہ دم ہے۔ اس نے اعلیٰ درجے کی سپورٹس شرٹ اور بھورے رنگ کا نیکر پہن رکھا تھا' داڑھی مونچھیں بالکل صاف۔ آفٹرشیولوشن کی خوشبو سے شیلٹن کا

کمرہ مہکنے لگا۔

سام ویسٹر اپنی عمر سے کئی برس چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

"تم نے مسٹر گرین والڈ کو اطلاع دے دی؟"

"جی جناب' اب وہ آج کے بجائے کل رات آئیں گے۔"

"اچھا شیلٹن الوداع! تمہارا ساتھ چھوڑتے ہوئے مجھے صدمہ بھی ہے۔"

"یہی حال میرا ہے مسٹر سام۔" شیلٹن نے کہا اور ڈیسک کے اندر رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل نکال کر دو گلاس پر کیے۔ ایک گلاس اس نے سام کی طرف بڑھایا۔ "یہ الوداعی جام میری طرف سے........."

سام نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں شیلٹن تم پیو۔ میں فٹ بال کا کھلاڑی ابھی زیرِ تربیت ہوں اور تمہیں پتہ ہے زیرِ تربیت کھلاڑیوں کو شراب پینے کی اجازت نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔

"اچھا دوست' الوداع .... مجھے جلد کمرے میں پہنچ جانا چاہیے۔ اور ہاں......... اب سب کچھ تمہارا......... ہوٹل بھی اور کمرہ نمبر312 بھی......... میرا مکان بھی اور میری کار رولز رائس بھی........."

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شیلٹن خاصا اداس دکھائی دیتا تھا۔

"خدا حافظ! مسٹر سام......... آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔"

"شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" سام نے قہقہہ لگایا۔ "اب میں چلتا ہوں......... اور ہاں' اخباروں اور رسالوں میں کھیلوں کے صفحات پڑھنے نہ بھولنا۔"

اس نے کمرہ نمبر312 کی چابی شیلٹن سے لے لی اور جھومتا تھرکتا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ قفل میں چابی ڈالتے ہوئے بہت مختصر سے وقفے کے لیے اسے گھبراہٹ سی ہوئی لیکن اس نے گردن کو جھٹکا دے کر اسے دُور کیا اور دروازہ کھول کر

اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ نمبر312 حجلۂ عروسی کی طرح سجا تھا۔ آرام دہ بستر پر لیٹ کر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہیں جما دیں۔ ڈائل کی چمک دار سوئیاں اسے حرکت کرتی صاف نظر آ رہی تھیں۔

اب وہ اپنے غائب ہونے کا منتظر تھا۔

تصور کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ وہ سٹیڈیم میں موجود ہے۔ لاکھوں تماشائی........ سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ تماشائی اسے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوتے جا رہے ہیں اور چیخ چیخ کر ہاتھ ہلا ہلا کر نعرے لگا رہے ہیں۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔

سام و یبسٹر' بستر پر لیٹا انہی خوش کن مناظر میں گم تھا۔

یک لخت کمرے میں روشنی کا جھپاکا سا ہوا اور میوزک بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس میوزک میں بڑا جوش و خروش تھا۔ بے اختیار سام و یبسٹر کے بازو اور ٹانگیں موسیقی کے زیروبم کے ساتھ ساتھ حرکت میں آ گئے۔ اسے یاد نہیں وہ کب بستر سے اٹھا اور کیونکر ناچنے لگا۔

آہستہ آہستہ اس کا ذہن صاف ہوتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا چاروں طرف تیز روشنی ہے........ اتنی تیز کہ آنکھیں چندھیائی جاتی ہیں۔ اس کی ٹانگیں اور بازو مسلسل رقص کے زاویے بنا رہے ہیں۔ وہ بے اختیار موسیقی کے ساتھ ساتھ تھرک رہا ہے۔ اس کے دائیں بائیں عورتیں،مرد اور حسین لڑکیاں دیوانہ وار رقص کر رہی ہیں۔ وہ سب کے سب رقاص ہیں۔ سام و یبسٹر نے جھک کر اپنی متحرک ٹانگوں کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نوجوان کی ٹانگیں تھیں۔ سڈول چست اور گوشت سے بھری بھری........ ایک اعلیٰ درجے کے رقاص کی ٹانگیں........

سام و یبسٹر کا ذہن اب پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گروف تھیٹر کے شاندار سٹیج پر والہانہ انداز میں رقص کر رہا ہے۔

*

برطانیہ میں ڈاکوؤں کی تنظیمیں اور اُن کا حیرت انگیز طریقِ کار

برطانیہ کے قدامت پرست افراد کا جو نسلاً" در نسلاً" قانون کی پیروی کرتے آ رہے ہیں' یہ خیال ہے کہ چوری کے مال میں کبھی برکت نہیں ہوتی' اور یہ کہ "مال حرام بود بجائے حرام رفت" کی ضرب المثل ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ لیکن ان سادہ لوح لوگوں کو شاید یہ علم نہیں کہ آج کل سائنس کا دور ہے اب وہ زمانہ نہیں رہا جب چوری کو ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا تھا۔ اب چوری اور سرقہ نے فن کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس "فن" کے ماہرین نہ صرف روپیہ "کمانا" جانتے ہیں بلکہ روپے کو صحیح معنوں میں صرف بھی کر سکتے ہیں اور مزہ یہ کہ ان کی آمدنی پر حکومت نہ کوئی ٹیکس عائد کر سکتی ہے اور نہ ان کو ٹیکس دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

دراصل ڈاکہ زنی کا فن اب ان کے لیے تجارت کی ایک باقاعدہ شکل بن گیا ہے اور اس تجارت کے تاجروں نے جو اصول اور تقسیم کار وضع کی ہے اس کی بنا پر ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ رائے میری نہیں بلکہ خود پولیس کے اعلیٰ افسروں اور بعض مجرموں کی ہے جو اس تجارت سے عرصہ ہوا ریٹائر ہو چکے ہیں اور اب "باعزت" زندگی بسر کرتے ہیں۔

حال ہی میں برطانیہ میں بنکوں کو لوٹنے کی اتنی وارداتیں بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں کہ سارا ملک چونک اٹھا ہے۔ اور لندن کے پانچ بڑے بڑے بنکوں نے تو شہر کے درو دیوار پر جہازی سائز کے پوسٹر تک چسپاں کرا دیئے ہیں۔ مثلاً" ایک بنک کا پوسٹر ہے۔

بنک پر ڈاکہ

لندن کلیرنگ بنک اپنے آئندہ نوٹس کی میعاد تک پبلک
کے ہر اس فرد یا افراد کو ایک ہزار پونڈ انعام دے گا جو بنک کے

کسی بھی ڈاکو یا ڈاکوؤں کے بارے میں سمعی یا بصری اطلاع پولیس یا بنک کے حکام کو مہیا کرے گا اور یہ اطلاع ان ڈاکوؤں کی تلاش یا گرفتاری میں ممد و معاون ثابت ہو سکے جو تمام برطانیہ میں اس بنک کی کسی بھی شاخ میں گھسنے اور روپیہ لے کر فرار ہونے کی تگ و دو کریں۔

پندرہ ماہ کے ایک مختصر عرصے میں جو گزشتہ سال ختم ہوا ہے' برطانیہ میں ڈاکوؤں کی تنظیموں نے ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ کی آمدنی حاصل کی۔

پولیس کی جان توڑ کوششوں کے بعد صرف تین مجرموں کو قانون کے حوالے کیا جا سکا۔ اس موقع پر ذہن میں چند دلچسپ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا امریکہ میں ڈاکوؤں کی وسیع تنظیموں کی مانند برطانیہ میں بھی اسی اصول پر ڈاکوؤں کی جماعتیں کام کر رہی ہیں یا ان وارداتوں کے پس پردہ کوئی "اعلیٰ دماغ" یا کئی "اعلیٰ دماغ" ہیں جو وارداتوں کے بے نظیر منصوبے بناتے ہیں اور عارضی طور پر ایک گروہ بن جاتے ہیں اور مقصد پورا ہونے کے بعد یہ گروہ منتشر ہو جاتا ہے؟ مثال کے طور پر اس واردات کو لے لیجئے جو اکتوبر 1959ء میں وقوع پذیر ہوئی تھی اور جس نے تمام ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ لندن کے علاقہ ایسٹ اینڈ میں آدھی رات کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے چار دکانوں پر ڈاکہ ڈالا اور نہایت کامیابی سے دو لاکھ پونڈ کے جواہرات' سونا چاندی کے زیوارت اور نقد روپیہ لے کر فرار ہو گئے اور پولیس ان کی گرد بھی نہ پا سکی یا پھر وہ واردات جو گزشتہ سال بارکلے بنک کی ہانکنے برانچ میں پیش آئی تھی اور ڈاکو ایک لاکھ پونڈ کے نوٹ تجوری کھول کر لے گئے تھے۔ یہ برطانیہ میں بنک پر ڈاکہ زنی کی سب سے بڑی واردات تھی یا پھر اس نوعیت کی واردات جس میں مشہور ایکٹرس صوفیہ لارین اپنے ایک لاکھ پچاسی ہزار پونڈ مالیت کے زیورات سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور یہ زیورات دن دہاڑے لندن کے قریب ایک دیہی مکان سے صاف غائب ہو گئے' جہاں صوفیہ لارین ٹھہری ہوئی تھی۔

ان وارداتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص یا اشخاص نے ہرگز

سرانجام نہیں دیں جو ان پڑھ اور اناڑی تھے۔ بلکہ ان کے پیچھے وسیع علم، گہرا تجربہ، کمال ہوشیاری، جرأت اور بہترین ذرائع کی سہولتیں کام کر رہی تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ وارداتیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں لائی جاتی ہیں تو آخر کن ذرائع پر ان کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور وہ "ذرائع" کہاں سے دست یاب ہوتے ہیں؟ فرض کیجئے کہ آپ ڈاکوؤں کی تنظیم کے "اعلیٰ دماغ" ہیں۔ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں جوہری کی دکان میں چند نادر جواہر موجود ہیں جن کی مالیت دو لاکھ پونڈ تک ہے۔ آپ محض اسی اطلاع پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے جب تک کہ آپ کو یقین کامل نہ ہو جائے کہ وہ جواہرات فی الواقع اصلی ہیں؟

ان تمام سوالات کے جوابات کی تلاش میں میں نے پولیس اور مجرموں کے کئی تجربہ کار افراد سے گفتگو کی ہے۔ چنانچہ ایک سابق نقب زن اور جنگ کے دوران ایک سابق جاسوس ایڈی چاپ مین نامی شخص نے مجھے ان سوالات کا جواب دیا ہے۔ ہر چند کہ وہ نقب زنی اور تجوری توڑنے کے پیشے سے "ریٹائر" ہو چکا ہے لیکن پھر بھی مجرموں کی "پُراسرار دنیا" کے بارے میں اس کی معلومات کافی دقیع ہیں۔ چاپ مین کی رائے میں.........

> نہ تو ڈاکوؤں کی کوئی تنظیم مستقل طور پر قائم رہ سکتی ہے اور نہ ان کا کوئی ایک ماسٹر پلانر ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "کاروباری" اعتبار سے کوئی ایسی تنظیم یا گروہ تشکیل پا ہی نہیں سکتا اگر کوئی اپنی مستقل حیثیت قائم رکھنے کا متمنی ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ ان سب چوروں اور نقب زنوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار ہمیشہ قائم نہیں رہتا اور نہ رہ سکتا ہے۔
>
> برطانیہ میں مجرموں کے میل اور ملاپ اور رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ شراب خانے اور کلب ہیں، جہاں وہ مجرم جو کسی خاص منصوبے پر اکٹھے عمل درآمد کرنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے

سے عارضی طور پر رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو "آمدنی" کو مناسب حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی راہ لیتا ہے اور پھر کسی موقعہ پر گاہے گاہے ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کر لیتے ہیں۔ انہی کلبوں کے ذریعے نہ صرف ایک عادی مجرم اپنے "ساتھیوں" کو ایک جگہ جمع کر سکتا ہے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر چوری شدہ کار' کار ڈرائیور' تجوری کھولنے کا ماہر اور مسروقہ مال کا خریدار تک دستیاب ہو جاتا ہے۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ لندن کے ان چھوٹے بڑے شراب خانوں کی بدولت برطانیہ میں جرائم کی وارداتوں میں کثرت سے اضافہ ہوا ہے۔ پیشہ ور مجرموں کے لیے یہ کلب ایک قسم کی "پارلیمنٹ" اور پناہ گاہ کا کام کرتے ہیں۔ انہی مقامات پر مجرموں کے بیشتر منصوبے کارروائی کے لیے پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں اور یہیں پر ناپختہ چوروں کی تربیت کی جاتی ہے۔ بہرحال چوروں کے اس "پر اسرار مقام" کا یہ نقشہ خصوصی حیثیت نہیں رکھتا۔ ماہرینِ فن مجرم اپنی شخصیت ہمیشہ پردے ہی میں چھپائے رکھتے ہیں اور صرف رات کو اپنی خفیہ قیام گاہ سے برآمد ہوتے ہیں اور وہ بھی ان راتوں میں جبکہ کوئی خاص معرکہ سر کرنا ہو۔

مجرموں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے پہلے درجے کے وہ مجرم ہیں جو اپنا "کمایا" ہُوا روپیہ' جوئے اور عورتوں پر صرف کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اس روپے سے کوئی نہایت صاف ستھرا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ وہ لوگ زیادہ تر مجرم بنتے ہیں جن کو جوئے کی لت پڑ جاتی ہے۔ جب تک کاروبار یا بنک کا روپیہ ساتھ دیتا ہے' دھڑلے سے جُوا کھیلتے ہیں۔ لیکن روپیہ ختم ہو جانے کے بعد ان کے لیے یہی صورت باقی رہتی ہے کہ کسی بنک یا کسی امیر آدمی کے گھر میں ڈاکہ ڈالیں........ اور جوئے کا شوق پورا کریں۔

چنانچہ حال ہی میں ایک ایسا ہی مجرم گرفتار ہوا تھا' اسے جُوا کھیلنے کی عادت

تھی۔ ایک روز جوئے کی میز پر وہ تین ہزار پونڈ ہار گیا۔ ہارنے کے بعد وہ کلب سے باہر نکلا اور اسی وقت لندن کے ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر کے گھر پہنچا۔ گندے پانی کے پائپ کے سہارے چڑھ کر اوپر گیا۔ تجوری کھول کر نوٹوں کے بنڈل نکالے اور پھر واپس جوئے گھر میں پہنچ گیا۔ لیکن چونکہ اس نے اپنی اس مہم کے لیے پہلے سے کوئی اسکیم تیار نہیں کی تھی' اس لیے پکڑا گیا اور آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔

دوسری طرف جیل خانے ایسے مجرموں کی مزید تربیت گاہیں بن رہے ہیں جو نقب زنی اور سرقے کی ابتدائی وارداتوں میں ناتجربہ کاری کی بنا پر پکڑے جاتے ہیں۔ انہی جیل خانوں میں شوقیہ طور پر جرائم کی وارداتیں کرنے والے ناتجربہ کار نوجوان پختہ کار اور ماہر فن مجرموں کی شاگردی اختیار کرتے ہیں اور ان "استادوں" سے شاگرد وہ تمام داؤ اور ہتھکنڈے سیکھ جاتے ہیں جو انہیں مستقبل میں ایک پیشہ ور چور بنانے کے لیے کافی ہوتے ہیں اور جیلوں سے رہا ہونے کے فوراً بعد ہی اکثر مجرم بڑی بڑی وارداتوں کے منصوبے بناتے اور انہیں عمل میں لایا کرتے ہیں اس لیے کہ ان کی جیب خالی ہوتی ہے اور انہیں اپنے پرانے ذوق کی تسکین کے لیے روپیہ فوری طور پر درکار ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ کسی بنک یا جوہری کی تجوری لوٹنے پر نمودار ہوتا ہے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ مجرم اپنی وارداتوں کے منصوبے کس طرح تیار کرتے ہیں اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہیں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

مشاہدہ اور مطالعہ اس امر پر گواہ ہے کہ گروہ کا سردار یا "اعلیٰ دماغ" ہی سب سے پہلے واردات کا ایک خاکہ تیار کرتا ہے۔ سردار وہی شخص ہوتا ہے جو خود تجوری توڑنے کا اور اس میں سے مال نکالنے کا ماہر ہو' اس کے سوا کوئی شخص تجوری کو ہاتھ بھی لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جب کسی واردات کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے تو اب سردار کو جو پہلی ضرورت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے صحیح صحیح اطلاعات ملیں۔

یاد رکھئے کہ آج کل جرائم کے بڑے بڑے کارنامے محض اتفاقی طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتے' ان کے پس پردہ ایک مکمل نقشہ صحیح اور باوثوق اطلاعات اور کامل تیاری کے ذرائع کام کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے کام کو ایک "ڈیوٹی" سمجھ کر

سرانجام دیتا ہے۔ کامیاب مجرموں کا اصول یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی بنک کی لاری پر خوامخواہ حملہ کر دیں' خواہ اس میں سے ایک دھیلا بھی برآمد نہ ہو۔ سب سے پہلے انہیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ جس کام کو وہ سرانجام دینا چاہتے ہیں' اس میں سو فی صدی کامیابی یقینی ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مال زیادہ مقدار میں دست یاب ہو سکتا ہے۔

گروہ کے "لیڈر" کو مختلف نوعیت کے ذرائع سے مختلف خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ایک سی آئی ڈی آفیسر نے مجھے بتایا کہ.........

"بہت سے اعلیٰ گھرانوں کے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے ہیں جن کا پیشہ یہی ہے' کہ مجرموں کو ان "ہائی کلاس پارٹیوں کی صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ جن میں وہ شریک ہوئے ہوں۔ یہ لڑکے دیکھتے رہتے ہیں کہ کن کن مہمان عورتوں نے کون کون سے قیمتی زیور پہن رکھے تھے اور خود میزبان خاتون کس مالیت کے زیور پہنے ہوئے تھی اور یہ کہ گھر کی تجوری کہاں رکھی ہے۔"

اس کے علاوہ گروہ کا لیڈر کسی سوسائٹی میگزین یا کسی اخبار کے فکاہی کالم میں بھی بڑا قیمتی مواد جمع کر سکتا ہے۔ ان رسالوں میں تصویریں بھی ہوتی ہیں مثلاً" کسی مال دار خاتون یا ایکٹرس کی تصویر اس حالت میں چھپی ہے کہ اس نے گلے میں ہیروں کا ایک بیش قیمت ہار پہن رکھا ہے' جس کی مالیت کسی طرح بھی پچاس ہزار پونڈ سے کم نہیں......... اور اس تصویر کے نیچے لکھا ہے کہ.........

"لیڈی ایکس" آئندہ ماہ فلاں تاریخ کو لندن تشریف لا رہی ہیں اور فلاں میزبان کی مہمان ہوں گی۔"

رسالے نے تو اپنے قارئین کی معلومات کے لیے یہ تصویر چھاپ دی اور فارغ ہو گیا لیکن اسے معلوم نہیں کہ ڈاکوؤں کے لیڈر کے لیے اس نے کتنی قیمتی

اطلاع بہم پہنچائی ہے۔

بنکوں اور ڈاک خانوں اور جوہریوں کی دکانوں پر کام کرنے والے بعض ملازمین بھی ڈاکوؤں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور انہیں بھاری رشوتیں دے کر ہر قسم کی "خبریں" حاصل کر لی جاتی ہیں۔ جس عمارت یا بنک پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے' ڈاکو اس کی کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ وہ اس عمارت کے نقشے تک حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں تہہ خانے کا راستہ کس طرف ہے اور فلاں کمرے میں تجوریاں رکھی ہیں۔ بنک نے خطرے کے جو الارم لگا رکھے ہیں' وہ کس طریقے سے بیکار کیے جا سکتے ہیں۔ تجوریوں میں جو ہزاروں کلو واٹ کی برقی رو دوڑ رہی ہے اس سے محفوظ رہنے کے کیا طریقے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کارروائی کے بعد یعنی جب یہ یقین ہو جائے کہ مہم میں کامیابی ہو گی اور اتنی قیمت کا مال (زیور یا جواہرات) ہمارے ہاتھ لگ جائے گا' تو ڈاکو اس مال غنیمت کا "خریدار" تلاش کرتے ہیں۔ خریدار کی تلاش چوری کرنے سے پہلے ہی کر لی جاتی ہے۔

تجوریاں توڑنے کے لیے وہ بارود استعمال کر لیتے ہیں یا ایک خاص قسم کا پلاسٹک...... جو آگ دکھاتے ہی دھماکے سے اڑ جاتا ہے اور تجوری کا آہنی دروازہ فوراً" کھل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں نقب زنی کے آلات و اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تالوں کو کھولنے کے لیے ہر قسم کی چابیاں بھی ان کے پاس موجود ہوتی ہیں۔

ان تمام تیاریوں کے بعد مرحلہ آتا ہے' ان کاروں کا جو اس مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ بہت سے مجرم چوری شدہ کاریں استعمال کرتے ہیں۔ شاید آپ یہ سن کر تعجب کریں کہ لندن میں اکثر گیراج کیپر ایسے ہیں جو کرائے پر ڈاکوؤں کو موٹر کاریں مہیا کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک فن ہے اور کمال یہ ہے کہ پولیس ان پر قطعاً" ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ لندن کے ایک نواحی قصبے میں موٹروں کی ایک گیراج کا مالک یہ کام کرتا ہے۔ ایک کار پر وہ ایک رات کے لیے "صرف" ایک سو پونڈ کرایہ طلب کرتا ہے اگر ضرورت پڑے تو ڈرائیور بھی مہیا کر سکتا ہے۔

میری اطلاعات کے مطابق اس گ
فہرست اپنے پاس رکھتا ہے جو شہر کے مختلف
ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ اسے ایک ایسی
اور واپس آنے کے وقفے تک اسے استع
رہتی ہو۔ پس ایسی کار ڈاکہ کے لیے مہیا ک
کا اسپیڈو میٹر اپنی پہلی حالت میں ترتیب
ہو کہ کار اس کی لاعلمی میں استعمال ہوئی
کیونکہ کار کا مالک اس کی "عارضی چوری
اس کے متعلق کوئی رپورٹ موجود نہیں ہو

اگر عین موقعۂ واردات پر کوئی را
تب بھی مجرموں کا سراغ نہیں لگایا جا سک
ہے اور اس سے دریافت کرتی ہے کہ
میں ڈاکوؤں نے تمہاری کار کیسے استعمال
رپورٹ پولیس میں کیوں نہیں درج کرائی
ان سوالات کا کیا جواب دے سکتا ہے.....

مال غنیمت حاصل ہوتے ہی ایک
پہنچا دیا جاتا ہے' اور چند گھنٹوں کے اند
ہے۔ پھر پولیس لاکھ سر مارے' چوری ش
وصول ہوتے ہی گروہ کا لیڈر سب کو حصہ
مول نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ عین ممکن ہے
پولیس کو گمنام خط بھیج کر سب کو گرفتار کر

راج کا مالک ان تمام کاروں کی ایک مکمل
ف مقامات پر ساری ساری رات کھڑی رہتی
ی کار کا علم ہو جس کا مالک محض کام پر جانے
مال کرتا ہو اور بقیہ وقت کار گیراج میں بند
کر دی جاتی ہے۔ کام نکل جانے کے بعد اس
دے دیا جاتا ہے تاکہ کار کے مالک کو شبہ نہ
ہے اور پھر اسے گیراج میں پہنچا دیا جاتا ہے۔
ں" سے لاعلم ہوتا ہے۔ اس لیے پولیس میں
وتی.........
ہ گیریا پولیس کا آدمی کار کا نمبر نوٹ کر لے'
تا کیونکہ پولیس کار کے مالک کے پاس پہنچتی
اؤ گزشتہ رات فلاں وقت ڈاکے کی واردات
ی کی؟ اگر چوری ہو گئی تھی تو تم نے اس کی
ں؟ اب آپ خود فرمائیے کہ بیچارہ کار کا مالک

....

گھنٹے کے اندر اسے خریدار کے ہاتھوں میں
ر اندر یہ مال ملک سے باہر روانہ کر دیا جاتا
دہ مال برآمد نہیں کر سکتی۔ خریدار سے رقم
تقسیم کر دیتا ہے۔ کسی کا حصہ روکنے کا خطرہ
کہ اپنا حصہ نہ ملنے پر کوئی ڈاکو مشتعل ہو کر
را دے۔

**